ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ

نویں کتاب

ستمبر ۲۰۰۳ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey@poetic.com

مطبع: حافظ پرنٹنگ پریس، ملتان

قیمت: بیس روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں	سید عامر سہیل	۳
مضامین:		
۲۔ حمایت علی شاعر اور استقامتِ فکر و فن	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۴
۳۔ لفظ ''سرائیکی'' پر ایک نظر	شوکت نعیم قادری	۸
۴۔ اُردو زبان کا ہمارے معاشرے میں کردار	ایم خالد فیاض	۱۴
نوبل خطبہ:		
۶۔ نیلسن مینڈیلا کا نوبیل خطبہ برائے امن	نیر عباس زیدی (مترجم)	۲۲
کہانیاں:		
۷۔ رکشاس کے باسی اور سمندری مارکیٹ	پُو سونگ لنگ/شگفتہ حسین	۲۶
طلائی دانت	گلی ترقی/رشید قیصرانی	۳۷
بانجھ زمین	رانی آکاش ہاشمی	۵۰
مزاحیات:		
۸۔ ذکرِ صبو	احمد ندیم تونسوی	۵۳
سلسلہ وار ناول:		
۹۔ ایک مرد (تیسری قسط)	اوریانا فلاشی/خالد سعید	۵۹
شاعری:		
۱۰۔ دو غزلیں	جعفر شیرازی	۶۹
۱۱۔ دو غزلیں	فہیم شناس کاظمی	۷۰
۱۲۔ دو غزلیں	عطاالرحمٰن قاضی	۷۱
۱۳۔ ایک غزل	نعیم ساگر	۷۲
۱۴۔ ایک غزل	عاصم احمد	۷۲
۱۶۔ ایک غزل	اکرم عتیق	۷۳
۱۷۔ فکر کے نئے زاویے (نظم)	ڈاکٹر خیال امروہوی	۷۴
۱۸۔ خود کلامی (نظم)	نوشی انجم	۷۵
خواب اور حقیقت	سید عامر سہیل	۷۶
حروفِ زر (قارئین کے خطوط):		
۱۹۔ قارئین کے خطوط		۷۷

سید عامر سہیل

چند باتیں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ستارۂ امتیاز)

حمایت علی شاعر اور استقامتِ فکر و فن

حمایت علی شاعر، ہمارے عہد کی دنیائے شعر و ادب کا ایک بڑا نام ہے، آپ کہیں گے کہ ''بڑا'' کا لفظ تو ایک بے تشخص، عمومی اور مبہم کلمہ، صفت کی حیثیت رکھتا ہے، اس لفظ کو کسی بھی شاعر یا ادیب کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے، یہ درست ہے تو پھر اس جگہ اس لفظ کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے، حمایت علی شاعر کو ''بڑا'' کہنے کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر و ہم عمر شاعروں اور ادیبوں کی بہ نسبت زندگی اور زندگی کے مسائل کے بارے میں زیادہ سوچتا ہے، زیادہ غور کرتا ہے، زیادہ پڑھتا ہے، زیادہ محسوس کرتا ہے اور اپنی سوچ اور اپنے احساس کو لفظوں کا پیکر دینے کی حیرت انگیز صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ نثر و نظم دونوں میں لکھتا ہے خود اعتمادی و یقین کی راہنمائی میں لکھتا ہے، مظلوم و کمزور کی ہم نوائی میں لکھتا ہے، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور حسن نیت و ریاضت فن کے ساتھ لکھتا ہے، خون کی گرمی اور جذبے کی صداقت و شدت کے ساتھ لکھتا ہے، سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر لکھتا ہے، زندگی کے گونا گوں مسائل اور گرد و پیش کے جملہ متعلقات کو موضوع بنا کر لکھتا ہے، نثر و نظم کی متعدد و مختلف ہیئتوں میں لکھتا ہے اور جو کچھ لکھتا ہے زندگی کی مثبت قدروں کی تائید و تکریم میں لکھتا ہے اور ایسے حیات افروز و دل نشیں پیرائے میں لکھتا ہے کہ ہم اسے اپنے عہد کا ایک بڑا ادیب، بڑا شاعر، بڑا فنکار اور بڑا نام ہی کہہ سکتے ہیں۔

بڑائی کے ان نشانات میں پہلا نشاں حمایتؔ کی شاعری ہے اس لیے کہ وہ عموماً اسی توسط سے پہچانا جاتا ہے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، حمایت علی شاعر، اکتسابی شاعر نہیں فطری اور پیدائشی شاعر ہے، بے سمتی، کج روی یا خط منحنی کا شاعر نہیں بلکہ روزِ اول سے خط مستقیم کا شاعر ہے، ثابت قدمی و استقامتِ فکر و فن کا شاعر ہے، اس کے بہت سے ہم عمر و ہم عصر، تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنے فکر و فن کے اظہار کے لیے راہیں بدلتے رہے ہیں، مقبولیت کی متبادل صورتوں پر غور کرتے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اس طرح آگے قدم بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی اصل چال بھی بھول گئے ہیں لیکن حمایتؔ کا معاملہ ان سب سے جداگانہ ہے انہیں اپنی شعر گوئی کے ساٹھ سالہ سفر میں کبھی یہ کہنے کی نوبت نہیں آئی کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

بات یہ ہے کہ حمایت علی شاعر کو بہت کم عمری میں اور شاعری کے سفر کے آغاز ہی میں مخدوم محی

الدین کے فکروفن کی راہبری میسر آ گئی تھی، حمایت علی شاعر اسی کو مشعلِ راہ بنائے ہوئے اور نامساعد حالات کے تھپیڑے کھاتے ہوئے زندگی کو سنوارنے، نکھارنے اور بامعنی بنانے میں لگے رہے، اپنے پہلے شعری مجموعے ''آگ میں پھول'' سے لے کر تازہ ترین مجموعہ ''آئینہ در آئینہ'' تک اسی راہِ مستقیم پر قائم رہے نہ کبھی بہکے اور نہ ان کے قدم ڈگمگائے، اس ثابت قدمی میں دو چار بڑے سخت مقامات آئے مگر حمایت کی خداداد ہمت وصلاحیت انہیں ہر مشکل مرحلے سے آسان گزار لے گئی، نتیجتاً وہ اپنے ہم عصروں، ہم عمروں اور اپنے ہم قدموں کے لیے ایک قابلِ رشک شخصیت اور مثال بن گئے کم از کم میرے لیے ان کی شخصیت بڑی قابلِ رشک ہے۔

اوپر میں نے حمایت علی شاعر کے فکروفن کی جس راہِ مستقیم کا ذکر کیا ہے اسی کا دوسرا نام ترقی پسند تحریک ہے اور اسی پر گامزن رہ کر مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز، جذبی، فیض، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے اُردو دنیا میں اپنا اپنا ایک امتیازی نشان بنایا ہے ان کے فوراً بعد کی نسل کے شاعروں میں بھی اس راہ پر چلے تو بہت سے لوگ، لیکن ثابت قدمی اور استقامت فکروفن کے باب میں پختگی و دلکشی کے حوالے سے وہ آثار پیدا نہ کر سکے جو حمایت علی شاعر کے یہاں نظر آتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ حمایت نے پورے شعور اور کامل ریاضتِ فن کے ساتھ اپنی شاعرانہ لے کو ہمیشہ شعریت و لطافت کے تابع رکھا اور اُس پر نظریے کو لادنے کی کوشش کبھی نہیں کی ہر چند کہ عملاً وہ ہمیشہ اپنے خیال و فکر اور نظریے کے قائل بھی رہے اور اس پر قائم بھی رہے لیکن لطافتِ شعری اور اظہار کی دلکشی و شگفتگی کو نظریے پر قربان کر دینے پر کبھی رضامند نہیں ہوئے اور اپنے ہر تخلیقی تجربے پر نظریے کو مجروح کیے بغیر، اپنی داخلیت کی مہر ثبت کرتے رہے چنانچہ غزل ہو یا نظم، ثلاثی ہو یا ہائیکو، منظوم خودنوشت ہو یا فلمی گیت، سب پر حمایت علی شاعر نے اپنی شخصیت وداخلیت کی چھاپ کچھ اس طرح لگا رکھی ہے کہ ان کی شاعری ان کی ہم عصر شاعری کے انبار میں آسانی سے پہچان لی جاتی ہے۔

حمایت علی شاعر کی ثابت قدمی اور استقامت فکر کے سلسلے میں بھی عرض کرتا چلوں کہ حمایت علی شاعر نے اپنی زندگی اور شاعری کو جس زاویہ نظر سے وابستہ رکھا ہے وہ شروع ہی سے ان کے اندازِ سخن سرائی کا معاون ومظہر رہا ہے۔ بطورِ مثال وثبوت اس جگہ میں ان کی صرف ایک بہت پرانی نظم پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ نظم ''وقت وقت کی بات'' کے عنوان سے اب سے تقریباً پچپن برس پہلے ادبِ لطیف، لاہور فروری ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم چونکہ حمایت علی شاعر کی شخصیت وسیرت اور فکروفن کے ان سارے لوازم کی ترجمان وعکاس ہے جو آج بھی ان کی زندگی وکلام میں پوری طرح جاری وساری ہیں، اسی لیے اس نظم کو سنتے چلیے کہ شاید اس سے پہلے نہ سنی ہو۔

وقت وقت کی آواز

دعوت:

گر ہو سکے تو اور ستم مجھ پہ ڈھا کے دیکھ
ہاں آزماء کے دیکھ، مجھے آزماء کے دیکھ
اپنی نگاہِ عزم شکن کی قسم تجھے
نظریں چرا کے دیکھ، نگاہیں ملا کے دیکھ

جیت:

اپنی ہر جیت کو میں ہار سمجھ بیٹھا تھا
ان کی خاموشی کو انکار سمجھ بیٹھا تھا
خامشی بھی ہے ادا ان کی، مجھے کیا معلوم
میں تو اب زندگی بیکار سمجھ بیٹھا تھا

شادی کے بعد:

لبوں پہ خندۂ بے اختیار آ ہی گیا
مری حیات پہ رنگ بہار چھا ہی گیا
ہزار چاہا زمانے نے میں تباہ رہوں
مگر کوئی مجھے اپنے گلے لگا ہی گیا

عزم:

میں نے ٹھانی ہے اور ہی دل میں
چاہے وہ بات، بات ہو کہ نہ ہو
میں سنواروں گا گیسوئے ہستی
زندگی کو ثبات ہو کہ نہ ہو

قسمت:

آپ انسان ہیں تو اِس سے کیا
کون سنتا ہے آپ کی فریاد
یہ تو قسمت کی بات ہے ہمدم
کوئی ناشاد ہو تو کوئی شاد

یہ نظم اگرچہ مختصر ہے پھر بھی پانچ عنوانات میں تقسیم ہے۔ گویا جن عناصرِ خمسہ کے تحت حمایت علی شاعر کے فکروفن کا خمیر بنا ہوا ہے وہ سارے عناصر نہایت خوبصورتی سے اس نظم میں جگہ پا گئے ہیں۔

ہر چند کہ حمایت کی زندگی بڑی رنگا رنگ رہی ہے اور اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں کے مقابلے میں شاید انہوں نے زندگی کے نشیب وفراز بھی زیادہ دیکھے ہیں، بایں ہمہ زندگی کو روشن رکھنے اور روشن تر دیکھنے کی جو لگن ان میں اب سے ساٹھ سال پہلے تھی آج بھی موجود ہے چنانچہ اسی استقامت ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے آخر آخر ''آئینہ در آئینہ'' کے نام سے اردو کو ایک بے مثال طویل نظم دی دی، ہمارے یہاں قابلِ ذکر جدید طویل نظموں کی تعداد چار چھے سے زیادہ نہیں، اس وقت طویل نظمیں جو میرے ذہن میں ابھر آئی ہیں اُن میں جوش کی ''حرفِ آخر''، علی اختر حیدر آبادی کی ''قولِ فیصل''، سردار جعفری کی ''نئی دنیا کو سلام''، اختر الایمان کی ''سب رنگ''، جمیل الدین عالی کی نظم ''انسان'' اور خود حمایت علی شاعر کی نظم ''بنگال سے کوریا تک'' نیز ''آئینہ در آئینہ'' کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

یہ ساری نظمیں میری نظر سے گزری ہیں اور میں ان سب کی اہمیت وافادیت کا قائل ہوں، لیکن لطافتِ شعری اور موضوع ومواد کی رنگارنگی اور نظم کی ہیئت کے اعتبار سے حمایت کی نظم سب سے مختلف

ومنفرد ہے۔اس کا تھیم یا فکری کینوس فلسفیانہ یا مابعد الطبیعاتی نہیں بلکہ یکسر سماجی ومعاشرتی ہے اور اس میں روحِ عصر اور ثقافتی عناصر کچھ اس طرح سمو دیے گئے ہیں کہ یہ نظم محض ایک فرد کی منظوم خودنوشت نہیں رہی بلکہ ہمارے عہد اور ہمارے خطے کی تہذیبی وسماجی تاریخ بن گئی ہے۔اس کی مدد سے آپ ان سماجی عوامل و محرک کا ادراک آسانی سے کر سکتے ہیں جن سے پچھلی چھے دہائیوں میں آپ کا معاشرہ دوچار رہا ہے۔
حالانکہ حمایت علی شاعر نے اپنی عمر کے جس مرحلے میں آئینہ در آئینہ کے عنوان سے اردو کو یہ طویل نظم دی ہے اس میں غالب جیسا نابغہ شاعر بھی کہنے لگتا ہے کہ

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

لیکن حمایت علی شاعر کی نظم میں عمر وذہن کی طویل مسافت کے باوجود، کہولت واضمحلال کے آثار، کہیں نظر نہیں آتے۔حوصلہ مندیوں اور گرم خیالات کی جولانیوں کی جو پرچھائیاں مجھے ان کے پہلے شعری مجموعے ''آگ میں پھول'' میں نظر آتی ہیں۔وہی پرچھائیاں مزید عمیق وبامعنی ہو کر ان کی ساری تخلیقات پر چھائی ہوئی ہیں اور ''آئینہ در آئینہ'' میں خصوصاً در آئی ہیں۔ میں اسی استدلال واساس پر حمایت علی شاعر کو عزم واستقامتِ فکروفن کا شاعر کہتا ہوں۔
چنانچہ زندگی کو روشن رکھنے اور روشن تر دیکھنے کی جو لگن ان میں اوائل عمری میں تھی وہی لگن ستر برس کی مسافت طے کرنے کے بعد آج بھی موجود ہے اور یہ اسی استقامتِ فکروفن کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے زندگی میں جو چاہا وہ عموماً ہو گیا۔ان کی بڑی خواہش تھی کہ

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے

میں حمایت علی شاعر کو یقین دلاتا ہوں اور وثوق وایمانداری سے کہتا ہوں کہ اب وہ کچھ اور کہیں یا نہ کہیں ان کی بات لوگوں کے دل میں اتر چکی ہے اور تادیر دلوں میں برقرار رہے گی۔
اب رہ گئی حمایت علی شاعر کی مقبولیت وشہرت کی بات، تو مجھے کہنے دیجیے کہ وہ اس سلسلے میں فکروفن کی دلاویزی کے ساتھ مقدر کے بھی دھنی رہے ہیں، دربارِ عام تک تو وہ اپنے ترنم اور گیت ونغمہ کے ذریعے پہنچے اور بتدریج پہنچے لیکن دربارِ خاص میں ان کی باریابی اچانک ہوئی اور ایک بلند پایہ صاحب قلم کے وسیلے سے ہوئی۔ ہوا یوں کہ ۱۹۴۹ء میں جب ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی مشہور کتاب ''اردو غزل'' شائع ہوئی تو اس میں سہواً شاعر لکھنوی کے انتخاب کلام کے اوپر حمایت علی شاعر کا نام چھپ گیا۔حمایت نے اسے چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور اس سہو کی خبر عام ہونے سے پہلے اپنے پختگی فکروفن کی اساس پر حلقہ خاص میں اپنی مستقل جگہ بنالی۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے سہو کی طرف کسی کی نظریں نہ گئی کہ حمایت کا کلام ۱۹۴۹ء میں بھی شاعر لکھنوی کے کلام سے کمتر درجے کا نہ تھا۔

شوکت نعیم قادری

لفظ ''سِرائیکی'' پر ایک نظر

ناموں کی بھی ایک اپنی دنیا ہوتی ہے۔ نام، ہوتے تو لفظ ہی ہیں مگر جب وہ کسی بھی جنس سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو اِس تعلق کی وجہ سے نہ صرف اِن کی اپنی ہی ایک مخصوص شناخت متعین ہوتی ہے بل کہ وہ متعلقہ جنس کی بھی ایک بھرپور اور مخصوص شخصیت کا تعین کرتے ہیں۔ کسی بھی جنس یا نفس سے وابستگی کے بعد، ناموں میں ایک خاص نوع کی تاثیر دَر آتی ہے جو سامع کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ ناموں کا ایک اپنا سماجی، ثقافتی، تاریخی، سیاسی اور جغرافیائی پسِ منظر ہوتا ہے۔
سِرائیکی، پاکستان کے جنوبی گوشوں میں بولی جانے والی ایک بڑی اور اہم زبان کا نام ہے۔ مختلف ادوار اور جغرافیائی حدود میں اِس زبان کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ پھر سنتِ آدمؑ کی پیروی کرتے ہوئے اِس کے لیے ایک مخصوص نام ''سِرائیکی'' تجویز کیا گیا۔ اس نام کو انتہائی قلیل عرصہ میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بے پناہ پذیرائی میسر آئی۔ لوگوں نے اِسے تہہ دل سے شرفِ قبولیت بخشا۔
اِس مختصر تحریر میں لفظ ''سِرائیکی'' کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ جس میں اِس لفظ کے حوالے سے اِن سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۔ لفظ ''سِرائیکی'' کا اشتقاقی پسِ منظر کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے؟
۲۔ اِس زبان کو کون کون سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے؟ اور
۳۔ اِس کے لیے کب اور کس نے ایک مخصوص نام ''سِرائیکی'' تجویز کیا؟

آیئے! سب سے پہلے لفظ ''سِرائیکی'' کی نوعیت اور پسِ منظر جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔
اس سلسلے میں سب سے پہلے Linguistic Survey of India, Vol. VIII, Part I کے مرتب Sir George Abraham Grierson کی رائے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"In Sindhi, the word "Sir" means "head". From it is derived "Siro", the extremity of anything, and, hence, the upper part of Sindh .... From this, again, is derived the adjective "Siraiko" of or belonging to upper Sindh or the "Siro"(۱)

گریرسن ایک اور جگہ کہتے ہیں:

"The word "Siro" means "upper" and, with reference to upper Sindh, means "Upstream". It however, really means any country up the stream of Indus."(۲)

پروفیسر علی عبّاس جلال پوری اپنی تصنیف ''خردنامۂ جلال پوری'' میں گریرسن کے نظریے کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔

''سرائیکی کا معنی ہے سِرو یا بالائی سندھ کی زبان۔'' (۳)

اب ''سندھی اُردو لغت'' سے لفظ ''سِرو'' کے معانی دیکھتے ہیں تاکہ ہم پر اس لفظ کے معانی واضح ہوسکیں۔ یہ لفظ اسم جمع ہے۔ مذکر ہے۔ اِس کے معانی سِر، سِرا، چوٹی، شروع، ابتدا، بہی میں میزان لکھنے کی جگہ اور سندھ کا شمالی خطہ، کے ہیں۔ (۴)

یحییٰ امجد اپنی تصنیف تاریخِ پاکستان (وسطی عہد) میں کہتے ہیں:

''آج پاکستان کے وہ تمام علاقے جہاں سرائیکی بولی جاتی ہے تقریباً وہ سب کے سب اراکوسیا (اراکھوسیا یا اراکوسیا Arakhosia, Arachosia یونانی مصنفین قندھار سے ڈیرہ جات تک کے علاقے کے لیے اس لفظ کا استعمال کرتے تھے۔) میں شامل تھے۔ ذاتی طور پر مجھے لفظ ''سِرائیکی'' کا تعلق بھی ''اراکوسیا'' سے محسوس ہوتا ہے۔ ''اراکوسیا'' سے ''اراکوسی'' بنا ہوگا۔ اُس سے ''سراکوسی'' اور ''سراکوسی'' سے سِرائیکی۔'' (۵)

اِس کے بعد یحییٰ امجد سکندر مقدونی کے خلاف ملتان کے علاقے میں لڑی جانے والی جنگِ مزاحمت میں شریک دو جنگ جو اقوام ''سراکوسائی'' اور ''ملوئی'' کا حوالہ لاتے ہیں کہ شاید اس ''سراکوسائی'' قوم کے نام کے سبب لفظ ''سِرائیکی'' بنا ہوگا مگر وہ اس نظریے کی تردید کرتے ہیں:

''مقبولِ عام روایت کہ سرائی قوم کی بولی سرائیکی ہے ضرورت سے زیادہ سہولت پسندی ہے۔ تاریخی طور پر اتنے مختصر اور اتنے غیر اہم قبیلے (اگر اسے قبیلہ کہہ سکیں!) کی بولی اتنی بڑی ریاست کی لنگوا فرانکا اور عوامی زبان نہیں ہوسکتی۔۔۔۔ سرائی قبیلے کا خصوصی تعلق تجارت، حکومت، مذہب یا علم سے کبھی نہیں رہا کہ جس کی بنا پر اُن کی بولی تمام قبائل کی بولی بن جاتی۔'' (۶)

اسی تصنیف میں آگے چل کر یحییٰ امجد، لفظ ''سِرائیکی'' کے اشتقاق کے حوالے سے ایک اور نظریہ پیش کرتے ہیں:

''سورائی، وہی جگہ ہے جسے ''سوویرا'' بھی کہا گیا ہے اور اس جگہ آباد قوم کو ''سورائی'' کہتے تھے جسے یونانیوں نے Syrai لکھا ہے اور اسی سے لفظ ''سرائیکی'' ماخوذ سمجھا جاتا ہے۔ دراصل یہ لفظ ''سِرائی'' نہیں ہے ''سُورائی'' ہے۔ ڈاکٹر دانی نے لکھا ہے کہ لفظ سرائیکی دراصل ''سَووِیراکی'' تھا یعنی سندھ میں جو علاقہ ''سوویر'' یا ''سوویرا'' کہلاتا تھا، اُس کی زبان۔ ویدی زمانے میں موجودہ صوبہ سندھ کے اُس علاقے کو جو دریائے سندھ کے مشرق میں ہے ''سوویرا'' اور جو مغرب میں اُس کو ''سِندھو'' کہتے تھے۔ ان دونوں کو ملا کر ''سندھوسوویر'' کہتے تھے۔ بعد میں صوبہ سندھ میں دریائے سندھ کے مشرق میں واقع صرف اوپر کے حصے کو ''سوویرا'' کہتے تھے۔'' (۷)

سیّد نور علی ضامن حسینی اپنی تصنیف ''معارفِ سرائیکی'' میں ایک جرمن دانش ور پروفیسر آردان راتھ کے اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں کہ دریائے سندھو یعنی دریائے انڈس ''رِگ وید'' میں بیان کردہ دریائے سرسوتی ہی ہے۔ حسینی صاب کہتے ہیں:

''میرے خیال میں جرمن دانش ور نے صحیح کہا ہے کیوں کہ سرسوتی سے مراد دراصل ''سوپراس وتی'' ہوسکتا ہے۔۔۔۔ اور اسی بناء پر یہ یقین غالب ہوسکتا ہے کہ ''سِرائیکی'' کا لفظ دراصل ''سوپراکی'' تھا جو آہستہ آہستہ بگڑ کر ''سرائیکی'' ہوگیا۔ جس کو کسی نے ''سرائے کی'' سمجھا تھا۔'' (۸)

آیئے! اب ان تمام نظریات کا اعادہ کر کے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ گریرسن لفظ ''سرائیکی'' کا ماخذ سندھی زبان کا لفظ ''سِر'' بہ معنی head بتاتے ہیں۔ اِسی لفظ کا اُردو مترادف لفظ ''سَر'' ہے۔

۲۔ اِسی سے لفظ ''سِرو'' Siro بنا جس سے مراد ''کسی بھی چیز کی انتہا ہے۔'' اِسی لیے اس سے مراد ''سندھ کا بالائی حصہ'' ہے۔

۳۔ لفظ ''سِرو'' ہی سے اسم صفت Siraiko بنا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ''بالائی سندھ کا'' یا ''بالائی سندھ سے متعلق''۔

۴۔ گریرسن بالائی سندھ Upper Sindh یا سِرو Siro کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔

۵۔ گریرسن اپنے سروے میں ایک اور جگہ بھی سِرو (Siro) کو بہ معنی بالائی (upper) قرار دیتے ہیں۔

۶۔ بالائی سندھ Upper Sindh سے Upstream ہے یعنی دریائے سندھ کے اوپر کے حصے کی طرف یا دریائے سندھ کے پانی کے بہاؤ کے مخالف۔ اس سے مراد دریائے سندھ کے بہاؤ کے مخالف واقع علاقے ہیں۔

۷۔ سندھی اُردو لغت میں لفظ ''سِرو'' کے جو معانی درج ہیں وہ یہ ہیں: سِر، سِرا، چوٹی، شروع، ابتدا اور سندھ کا شمالی خطہ۔ ان مطالب سے بھی گریرسن کے نظریے کی تائید ہوجاتی ہے۔

۸۔ پروفیسر علی عباس جلال پوری کا نظریہ بھی یہی ہے کہ ''سِرائیکی'' سے مراد سِرو یا بالائی سندھ کی زبان ہے۔

۹۔ اِن تمام نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے گریرسن کا نظریہ زیادہ قرین قیاس ہے یعنی دریائے سندھ کے بہاؤ کے مخالف واقع علاقوں میں بولی جانے والی زبان۔ لفظ سِر یا سِرو سے لفظ Siraiko (اسم صفت) بنا اور پھر اسی سے لفظ ''سرائیکی'' متشکل ہو گیا۔

زبانوں کے ناموں کے پسِ منظر میں جغرافیائی عناصر بھی کارفرما ہوا کرتے ہیں۔ اِسی حوالے سے مجھے لفظ ''عِبرانی'' یاد آتا ہے جس کا مادہ ''عبور'' ہے۔ آرامی زبان میں اصل لفظ ''عِبر'' بہ معنی ''پار کرنا'' ہے۔ حضرت ابراہیمؑ دریائے فرات کے اُس پار سے آئے تھے۔ اِسی لیے انہیں اور اُن کی زبان کو ''عبرانی'' کہا گیا یعنی دریا پار کا شخص یا دریا پار کی زبان۔ (۹)

۱۰۔ یحییٰ امجد لفظ ''اراکوسیا Arachosia'' کو لفظ ''سرائیکی'' کی بنیاد قرار دیتے ہیں کہ اسی لفظ سے ''اراکوسی'' بنا پھر ''سراکوسی'' اور پھر ''سرائیکی''۔ یونانی مصنفین قندھار اور ڈیرہ جات کے علاقے کو ''اراکوسیا'' کہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈیرہ اسماعیل خان (صوبہ سرحد) میں سرائیکی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر قندھار تک اس کے اثرات کا نمایاں ہونا کوئی زیادہ قرینِ قیاس بات نہیں۔ ممکن ہے یونانیوں نے کسی انتظامی سلسلے میں اس علاقے کی اس تقسیم کر کے اُس کے لیے ایک مخصوص نام تجویز کر دیا ہو۔

۱۱۔ یحییٰ امجد نے سکندر مقدونی کے خلاف ملتان میں لڑی جانے والی جنگ مزاحمت میں شریک دو جنگ جو اقوام کا ذکر کیا ہے یعنی ''سراکوسائی'' اور ''ملوئی''۔ ان کے نزدیک ''سراکوسائی'' یا ''سرائی'' قوم کی زبان سرائیکی تھی مگر وہ خود ہی اس نظریہ کو رَد کرتے ہیں کیوں کہ ''سرائی'' قوم کسی بھی لحاظ سے کوئی نمایاں مقام نہ رکھتی تھی کہ ان کی زبان ایک وسیع علاقے کی ''لنگوا فرانکا'' قرار پاتی۔

۱۲۔ یحییٰ امجد لفظ ''سِرائیکی'' کے ماخذ کے حوالے سے ایک اور نظریہ پیش کرتے ہیں کہ ویدی زمانے میں موجودہ صوبہ سندھ کے اُس علاقے کو جو دریائے سندھ کے مشرق میں ہے ''سوویرا'' اور جو مغرب میں ہے اُس کو ''سِندھو'' کہتے تھے۔ ان دونوں کو ملا کر ''سندھو سوویر'' کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں صوبہ سندھ میں دریائے سندھ کے مشرق میں واقع صرف اوپر کے حصے کو ''سوویرا'' کہتے تھے۔

۱۳۔ اس ''سوویرا'' میں ''سورائی'' قوم آباد تھی جسے یونانی Syrai لکھتے تھے۔ اسی سے لفظ ''سرائیکی'' ماخوذ سمجھا جاتا ہے۔ یحییٰ امجد کہتے ہیں کہ یہ لفظ ''سرائی'' نہیں ہے بل کہ ''سُورائی'' ہے۔

۱۴۔ معروف ماہرِ آثارِ قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی بھی اسی نظریے کی تائید کرتے نظر آتے ہیں کہ لفظ ''سرائیکی'' درحقیقت ''سوویرا کی'' تھا یعنی سندھ میں جو علاقہ ''سوویر'' یا ''سوویرا'' کہلاتا ہے اُس کی زبان۔

۱۵۔ گریرسن کے نظریے کی مانند یہ نظریہ بھی قرین قیاس محسوس ہوتا ہے۔ اس کے پسِ منظر میں جغرافیائی عناصر کارفرما ہیں۔ دریائے سندھ کے مشرق میں صرف اوپر کے حصے کو ''سویرا'' کہتے تھے اور وہاں کی بولی جانے والی زبان ''سوویرا کی'' ہوئی۔ یہی لفظ بعد ازاں لفظ ''سِرائیکی'' بن گیا۔

۱۶۔ سیّد نور علی ضامن حسینی بھی لفظ ''سویرا کی'' کو ہی ''سِرائیکی'' کا ماخذ قرار دیتے ہیں مگر اُن کے نزدیک اس کا پسِ منظر مختلف ہے یعنی ''رِگ وید'' میں موجود دریائے سرسوتی ہی دریائے سندھ یا انڈس ہے۔ اسی لفظ ''سرسوتی'' سے ''سویراس وتی'' بن گیا اسی سے لفظ ''سویرا کی'' بنا پھر آہستہ آہستہ یہی لفظ ''سِرائیکی'' بن گیا۔ اس نظریے سے سِرائیکی زبان کی قدامت کا اشارہ تو ملتا ہے مگر لفظ ''سِرائیکی'' کی موجودہ ہیئت پر غور کرنے سے یہ نظریہ بھی مجھے قرینِ قیاس نہیں لگتا۔

۱۷۔ اُردو کو ''لشکر کی زبان یا بازار کی زبان'' کہا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے بعض محققین ''سرائیکی'' کو ''سرائے کی'' سمجھتے ہیں۔ یعنی سرائے میں بولی جانے والی زبان۔ یہ حقیقت ہے کہ زبانوں کے پنپنے کے لیے ایسی ہی جگہیں سازگار ہوا کرتی ہیں مگر سرائیکی کے حوالے سے مجھے یہ پسِ منظر قرینِ قیاس نہیں لگتا بل کہ جغرافیائی عناصر ہی زیادہ قرینِ قیاس ہیں۔ پھر گریرسن، پروفیسر علی عباس جلال پوری، یحییٰ امجد، ڈاکٹر احمد حسن دانی اور سیّد نور علی ضامن حسینی کی آراء کے بعد یہ نظریہ ماند پڑتا نظر آتا ہے۔

مندرجہ بالا لفظی بحث کے بعد ہم دوسرے سوال کی جانب آتے ہیں کہ لفظ ''سرائیکی'' کے انتخاب سے پیش تر، اس زبان کے لیے کون کون سے دیگر علاقائی نام مستعمل تھے؟

اس زبان کو مختلف ادوار اور خطوں میں ''ملتانی، ریاستی، بہاول پوری، جھنگی، لہندی، شاہ پوری، ڈیروی، جگدالی، جٹکی، تھلّی، کھِترّکی، لنڈی اور اُچکی وغیرہ جیسے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ (۱۰) (۱۱)

ہمارا آخری سوال یہ تھا کہ آخر کب اس زبان کے لیے ایک لفظ ''سرائیکی'' کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں ہمیں پروفیسر شوکت مغل اپنی سرائیکی تصنیف بہ عنوان ''سرائیکی دیاں خاص آوازاں دی کہانی'' (۱۲) میں بتاتے ہیں کہ ۱۹۶۲ء میں سُمرا پبلک ہائی اسکول ملتان میں چند دانش وروں کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت غلام قاسم خان خاکوانی نے کی۔ اس کے شرکاء جس میں ریاض انور ایڈووکیٹ، اختر علی خان، مولانا نور احمد فریدی، ڈاکٹر مہر عبدالحق، سیٹھ عبدالرحمان، علامہ نسیم طالوت، میر حسان الحیدری اور ارشد ملتانی شامل تھے۔

لفظ سرائیکی کے محرک ریاض انور ایڈووکیٹ تھے۔ دوسرے بہت سے ناموں کو رَد کرتے ہوئے میر حسان الحیدری نے اس نام کی تائید کی۔ کثرتِ رائے دہی سے یہی فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ ملتان،

بہاول پور اور ڈیرہ غازی خان کے علاقوں کے علاوہ جن جن علاقوں میں یہ زبان بولی جاتی ہے یا جہاں جہاں اس کے مختلف لہجے مستعمل ہیں اُن کے لیے ایک ہی مشترک لفظ ''سرائیکی'' استعمال کیا جائے گا۔

اس طرح سرائیکی زبان کے نام کے انتخاب کا مرحلہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا اور ہر طبقے کے افراد نے اس نام کو بہ خوشی قبول کیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب لوگ اس زبان کے لیے کسی ایک نام کے انتخاب کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے اور اب یہ نام ایک مخصوص اور وسیع علاقے میں بولی جانے والی زبان کی شناخت بن چکا ہے۔

حوالہ جات

Sir George Abraham Grierson, Linguistic Survey of India, Vol. VIII, Part I, Suprintendent Government Printing, Calcutta, India, 1919, Page 140.

// // Page 92

۳۔ پروفیسر سیّد علی عباس جلال پوری، ''خرد نامۂ جلال پوری''، خرد افروز جہلم، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷۹۔

۴۔ سندھی اُردو لغت مرتبہ: ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، ۱۹۸۵ء۔

۵۔ یحییٰ امجد، ''تاریخِ پاکستان (وسطی عہد)''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۶۲۔

۶۔ ایضاً ص ۶۳۔

۷۔ ایضاً ص ۳۷۶۔

۸۔ سیّد نور علی ضامن حسینی، ''معارفِ سرائیکی''، مصطفیٰ شاہ اکیڈمی محلّہ نقاش، احمد پور شرقیہ، ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

۹۔ پروفیسر سیّد علی عباس جلال پوری، ''خرد نامۂ جلال پوری''، خرد افروز جہلم، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹۸۔

۱۰۔ ایضاً ص ۱۷۹۔

۱۱۔ سرائیکی اُردو لغت، ای۔ او برائن / شوکت مغل، جھوک پبلی شرز، ملتان، ۲۰۰۱ء، ص ۴۔

۱۲۔ ''سرائیکی دیاں خاص آوازاں دی کہانی''، جھوک پبلی شرز، ملتان، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷۔

ایم۔ خالد فیاض

اُردو زبان کا ہمارے معاشرے میں کردار

اُردو ہماری قومی زبان ہے لیکن کسی زبان کا محض قومی زبان ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بلکہ قوم میں یا معاشرے میں اُس زبان کا کردار ہی اس کی اہمیت اور حیثیت کا تعین کرتا ہے۔

اگر معاشرتی حوالے سے اُردو زبان پر غور کیا جائے تو ہمارے ہاں اُردو کا کوئی واضح اور مثبت کردار نظر نہیں آتا۔ جس کی وجہ سے مایوسی بھی ہوتی ہے اور اُلجھن بھی۔ اس مایوسی کو دُور کرنے اور اُلجھن کو سلجھانے کے لیے اس مضمون میں اپنے معاشرے میں اُردو کے کردار کو سمجھنے اور اس کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مضمون کا آغاز اس سوال سے کیا جاتا ہے کہ آخر اُردو کو پاکستان کی قومی زبان کیوں قرار دیا گیا؟ اس کا سیدھا سادہ جواب جو دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں چونکہ مختلف زبانیں بولنے والے لوگ بستے ہیں اس لیے قومی رابطے کے لیے کسی ایک زبان کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ اردو پاکستان میں سب سے زیادہ (ثانوی زبان کے اعتبار سے) بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے، اس لیے اردو پاکستان کی قومی زبان ٹھہری۔ اس کے علاوہ اُردو پاکستان کی سالمیت اور بقا کی ضامن ہے۔ اتحاد کا باعث ہے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن اگر ہم تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معاملہ اتنا سیدھا نظر نہیں آتا۔ اُردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیئے جانے میں وہ حالات بھی برابر کے کارفرما ہیں جو تقسیم کے وقت، برصغیر کے تھے۔ خاص طور پر وہ حالات جن میں اردو ہندی تنازعہ جنم لیتا ہے اور جس کی وجہ سے اردو محض مسلمانوں کی زبان ٹھہرائی جاتی ہے، اس لیے کہ اس زبان میں عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کی آمیزش موجود تھی اور فارسی عربی زبانیں مسلمان حکمرانوں کے ساتھ باہر سے آئی تھیں۔ لہٰذا اس مغالطہ نے جنم لیا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس لحاظ سے اُردو ایک تو غیر ملکی زبان تصور کی گئی اور دوسرا برصغیر کے مسلمانوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ مسلمانوں نے بھی اردو زبان کو اپنی ہی ملکیت سمجھ لیا۔ اس طرح اردو زبان سے مسلمانوں کی مذہبی وابستگی پیدا ہو گئی اور پھر جب پاکستان وجود میں آیا، جس کی نظریاتی اساس بھی مذہب ہی تھا، تو اردو زبان کا پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی۔

اب ہمیں یہ جائزہ بھی لے لینا چاہیے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان کن معنوں میں ہے؟ کیا یہاں کے لوگوں کی مادری زبان اردو ہے؟ کیونکہ اکثر اوقات قومی زبان سے مراد وہ زبان لی جاتی ہے جسے قوم بطور مادری زبان کے بولتی اور سمجھتی ہو۔ لیکن پاکستان میں اردو زبان کے قومی زبان ہونے میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں کیونکہ بقول خلیل صدیقی، ہمارے ملک میں اردو کسی خطے کی پہلی یا مادری زبان

نہیں ہے۔ اردو کے قومی زبان ہونے کی ایک ہی دلیل ہے کہ یہ ملک میں سب سے زیادہ سمجھی جانے والی زبان ہے یعنی اردو قومی رابطے کی زبان ہے۔ اس لیے میں اس بات پر زور دیا کرتا ہوں کہ اردو کو محض پاکستان کی قومی زبان کہنے سے قومی رابطے کی زبان کہنا زیادہ بہتر اور مناسب ہے۔ اس طرح اردو کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ قائداعظم نے بھی اپنی تقریر میں اس بات کی طرف بھرپور اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا:

''پاکستان کی سرکاری زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہو، صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے۔ اسے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سمجھا جاتا ہے۔''

یہاں یہ بات واضح ہے کہ اردو کو افہام و تفہیم کی زبان قرار دیا گیا تھا۔ لیکن یہ دھیان رہے کہ اردو کو اظہار کی زبان یا تعلیمی و علمی زبان قرار دینے پر زور نہیں دیا گیا۔ صرف سرکاری زبان کی حد تک اردو کی اہمیت اُجاگر کی گئی ہے تاکہ مختلف صوبوں کے لوگوں میں افہام و تفہیم کی فضا قائم ہو سکے۔

کچھ لوگوں کو اس بات پر اعتراض ہے کہ اردو پاکستان کے تمام علاقوں میں یکساں طور پر سمجھی جاتی ہے۔ یہ اعتراض بجا لیکن یہ جانتے ہوئے پاکستان میں ذرائع ابلاغ کی زبان اردو ہے اور خاص طور پر ٹی۔ وی جیسے میڈیا کے گھر گھر پہنچ جانے کے بعد یہ تصور کرنا محال ہے کہ کہیں اردو نہ سمجھی جاتی ہو۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اردو کے قومی زبان ہونے پر اعتراضات کی نفی کر دی گئی ہے۔ پاکستان میں اردو کے قومی زبان قرار دیے جانے پر جو اعتراضات سامنے آئے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور ان کا تذکرہ کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ہمارے کچھ حلقوں میں اردو زبان کو پاکستان میں جبر کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں کہا جاتا ہے کہ اردو ہم پر مسلط کر دی گئی تھی؟ اس کی ایک معقول وجہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اُردو کو جب قومی زبان کا درجہ دیا گیا، اس وقت دوسری سب مقامی زبانوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ جو کہ ایک منفی رویہ تھا۔ ہم نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ پاکستان مختلف قومیتوں اور زبانوں پر مشتمل ملک ہے اور ہر قوم کی اپنی زبان اور اپنا کلچر ہے۔ زبان شناخت کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے اور مقامی زبانوں کو یکسر نظر انداز کر دینے سے مقامی شناخت پر زد پڑی جو ردِ عمل کا باعث بھی بنی۔ اردو سے متعلق ایسی پالیسیاں مرتب کی گئیں کہ مقامی اور مادری زبانوں میں لوگوں کا اظہار کرنا سہل نہ رہا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی مادری زبان بول تو سکتے ہیں لیکن روانی سے لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ تحریری اظہار میں بہر حال اردو کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جب کہ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ مادری زبان اظہار کا سب سے بہترین وسیلہ ہے اور اردو بہر حال ہماری پہلی یا مادری زبان نہیں۔ صرف رابطے کی

زبان ہے اور ثانوی زبان ہے۔ اس لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لسانی پالیسیاں اس طرح مرتب کی جاتیں کہ ہمیں اپنی مادری زبانوں میں اظہار کی مکمل قدرت حاصل ہوتی اور مادری زبانوں کو فروغ دینے کے عمل کو ملک دشمنی سے موسوم بھی نہ کیا جاتا بلکہ ماردی زبانوں کا اردو میں ترجمہ کر کے دوسرے علاقوں میں متعارف کرایا جاتا۔ اس طرح اردو اپنے رابطے کی زبان ہونے کا جائز حق ادا کرتی اور اس کے خلاف مخالفت کا طوفان بھی کھڑا نہ ہو پاتا۔

یہاں اس ضمن میں سویت یونین کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ جہاں رابطے کی زبان ''رشین'' تھی لیکن اپنے اپنے علاقوں کی تمام زبانوں کو قومی زبانوں کی حیثیت حاصل تھی اور ہر کسی کو اپنی زبان میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے کا پورا پورا اختیار تھا۔ رشین زبان کا کام اسے ٹرانسلیٹ کر کے دوسری ریاستوں تک منتقل کرنا تھا۔ اس طرح رشین زبان کسی ریاستی زبان کی حق تلفی کا موجب نہیں بنی۔

یہ درست ہے کہ کسی بھی ملٹی لینگوئل سٹیٹ میں کسی ایک رابطے کی زبان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مقامی زبانوں کے استحصال کا باعث بنے، یا اُن زبانوں کے تشخص کو مجروح کرے۔ ایسا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں علاقائی زبانوں کو بھی اپنی قومی زبانیں تسلیم کرنا ہوگا۔ کم سے کم پرائمری سطح تک ذریعہ تعلیم مادری زبانوں کو بنانا چاہیے تھا، یا ایک زبان کے طور شامل نصاب کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ ہم اپنی مادری زبانوں میں نہ صرف یہ کہ بلا جھجک اظہار کر سکتے بلکہ روانی سے لکھ پڑھ بھی سکتے۔

لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقامی زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ کیوں نہیں دے دیا گیا یا دے دیا جاتا؟ اس میں آخر کیا قباحت ہے؟ اس کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔

دراصل ہمارا ملک شروع سے ہی مطلق العنانیت کا شکار رہا ہے۔ یہاں پر ہمیشہ آمرانہ حکومتیں رہی ہیں۔ جمہوری حکومتیں بھی نام کی جمہوری تھیں، ان کی ذہنیت آمرانہ ہی رہی اور آمرانہ ذہنیت ون یونٹ کی متمنی ہوتی ہے۔ ایک زبان، ایک کلچر، ایک شناخت وغیرہ اور اسے ملکی سالمیت کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ آمرانہ ذہنیت تنوعات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ علیحدہ شناخت، علیحدہ زبان، علیحدہ کلچر کو ملک دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ملک نہ صرف یہ کہ ملٹی لینگوئل بلکہ ملٹی کلچرل سٹیٹ ہے لیکن ہم یہ حقیقت تسلیم کرنے پر تیار نہیں اور جب تک ہم اس حقیقت سے انکار کرتے رہیں گے، ہمارے مسائل جوں کے توں قائم رہیں گے۔ اس لیے کہ جب تک دوسرے کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے، اس وقت تک اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ''ایک'' ہونے کے لیے ''دو'' کا شعور ہونا ضروری ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اردو کو اپنے اپنے علاقوں کی زبانوں کے زیرِ اثر پھلنے پھولنے کا موقع دینا چاہیے۔ اور خالص اردو کے رجحان کا دامن چھوڑ دینا چاہیے۔ اس طرح ہی اردو کی نہ صرف صحت مند نشو و نما ہو سکتی ہے بلکہ وہ اپنا قومی کردار بھی موثر انداز سے نبھا سکتی ہے اور اگر ہم اردو کی بقا چاہتے ہیں تو ایسا

کرنا ضروری ہوگا کیونکہ کوئی زندہ زبان گریز کی زندگی بسر نہیں کرسکتی اور اگر وہ ایسا کرتی ہے تو زندہ نہیں رہ سکتی۔ زندہ زبان جذب وقبول کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ اردو زبان ماضی میں بھی اس روایت کی حامل رہی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ ومحاورات جذب کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لیے فطری طور پر اب اسے ارتقائی منازل سے گزرنے کے لیے علاقائی زبانوں سے ہی توانائی حاصل کرنا ہوگی اور اردو غیر شعوری طور پر اس عمل سے گزر بھی رہی ہے لیکن اس کی رفتار قدرے سست ہے۔ اردو کا انگریزی زبان سے بھی اخذ وقبول کا رشتہ جاری ہے اور یہ عمل زیادہ تیز رفتار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں انگریزی زبان کو بہ نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے انگریزی زبان کے الفاظ تیزی سے اردو کا حصہ بنتے چلے جارہے ہیں۔ بہرحال یہ کوئی بری بات نہیں اور نہ اس عمل کو شعوری طور پر روکا جاسکتا ہے۔ لیکن اسی طرح علاقائی زبانوں کے الفاظ کو بھی اردو زبان میں داخل ہونے سے روکنے کی بے سود شعوری کوشش سے باز آنا ہوگا۔

اگرچہ ہم اردو کو قومی رابطے کی زبان مانتے ہیں لیکن ذہنی طور پر اسے پوری طرح تسلیم نہیں کرتے۔ اگر صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو ہمارے ہاں یا تو ذرائع ابلاغ کی زبان ہے یا پھر ادب کی زبان ہے۔ اس کے علاوہ اردو کا یہاں کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ اردو نہ سرکاری زبان ہے نہ مادری، نہ تعلیمی زبان ہے اور نہ صحیح معنوں میں رابطے کی زبان ہے۔

جہاں تک اردو کے ادب کی زبان ہونے کا تعلق ہے تو بہت سے ادیب اور شاعر حضرات ایسے ہیں جو اب بھی اپنی تخلیق میں فارسی آمیز درباری اردو لکھنے سے گریز نہیں کرتے اور غیر ضروری ثقیل فارسی الفاظ سے اردو کو بنانے سنوانے کا کام لیتے ہیں۔ وہ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ علمی و ادبی تحریریں صرف فارسی آمیز اردو میں ہی خوبصورت لگتی ہیں چاہے ان کا ابلاغ ہو یا نہ ہو۔

ہمارے ان شاعروں اور ادیبوں کو بہرحال عوامی اردو زبان استعمال کرنا ہوگی۔ اردو میں لکھتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اردو، رابطے کی زبان ہے اور اردو کو ذریعۂ اظہار بنانے کا مقصد لوگوں سے رابطہ قائم کرنا ہے نا کہ درباری شاعروں کی طرح عام لوگوں سے فاصلہ بڑھانا مقصود ہے۔ پہلے شاعروں اور ادیبوں کا مسئلہ دربار میں اپنی حیثیت منوانے کا تھا۔ بادشاہوں کا قرب حاصل کرنا، ان کا مقصد تھا اور دوسرا فارسی زبان کا اثر ورسوخ بھی اس بات کا متقاضی تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب شاعر اور ادیب عوام سے مخاطب ہوتے ہیں اور فارسی بھی اپنا اثر ورسوخ کھو چکی ہے۔ اس لیے اب انہیں فارسی زدہ اردو کی بجائے عوامی لب ولہجہ اور مقامی الفاظ سے تشکیل دی گئی اردو اپنانا ہوگی۔

لیکن اس سے یہ مراد قطعاً نہیں کہ پست اور معیار سے گرے ہوئے مقامی الفاظ شامل ادب کرلیے جائیں۔ ادبی معیار بہرصورت ضروری ہے۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ اردو ادب کے معیاری الفاظ کا درجہ شعوری طور پر فارسی یا عربی زبان کے غیر ضروری ثقیل الفاظ کو نہ دیا جائے۔

ایسے فارسی زدہ ادیبوں (جن کی تعداد اگرچہ روز بروز کم ہورہی ہے) کی سائیکی کا تجزیہ کرنا بھی ضروری خیال ہوتا ہے، اس کے باوجود کہ اس کا براہ راست تعلق ہمارے موضوع سے نہیں۔

اصل میں ایسے ادیب اور شعراء عوام سے مخاطب ہونا چاہتے ہی نہیں۔ کیونکہ ان کے ذہنوں میں بورژوائیت کی چھاپ ہوتی ہے۔ یہ عوام کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ ہماری بات سمجھ سکتے ہیں۔ عام لوگوں سے مخاطب ہوتے وقت ان کا لہجہ، ان کے الفاظ، ان کا انداز، بورژوائیت کی چغلی کھاتا ہے۔ بظاہر یہ لوگوں کے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں لیکن درحقیقت انہیں اپنا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔

دراصل طبقاتی نظام نے ہم لوگوں کی سائیکی کی تشکیل اس طرح کی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ اور اونچا اٹھنا چاہتے ہیں۔ فاصلہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بیماری ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکی ہے اور اس کا شکار ہم ادیب اور شاعر لوگوں کی کچھ تعداد بھی ہے۔ ہمارے پاس عوام سے اونچا اٹھنے کے لیے مال وزر یا وسیع جائیدادیں نہیں ہوتیں، ہاں کچھ بھاری بھرکم الفاظ ہوتے ہیں جو علمی تفاخر کا درجہ حاصل کرلیتے ہیں اور ان کے ذریعے ہم عوام سے دُور ہونے کا راستہ نکالتے ہیں۔ لیکن یہ سائیکی چونکہ ادیب اور عوام میں صحت مند رشتہ ستوار کرنے میں مانع ہے لہٰذا ہمیں اس پر گرفت کرنا ہوگی۔

بہرحال اب ہم پھر اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں اور دوبارہ سے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اردو کو جبر کی علامت کیوں سمجھا جاتا رہا ہے؟ اسی طرح ہم کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو کو جبر کی علامت سمجھے جانے میں اردو زبان کا بذاتِ خود کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی اس قدر خطا ہے۔ ہمارے ہاں، لسانی پالیسی مرتب کرنے والا گروہ ہی (جو حکمران طبقے کا پروردہ ہے) اس کا اصل ذمہ دار ہے۔ سارا مسئلہ اطلاق کا ہے۔ اردو زبان کا اطلاق اس طرح سے ہو ہی نہیں سکا یا ہونے ہی نہیں دیا گیا جس طرح سے ہونا چاہیے تھا۔

اصل میں معاشرتی سطح پر اردو زبان سے ہمارے ہاں طبقاتی نظام کی تشکیل کا کام لیا جارہا ہے۔ سماجی جائزے کے بعد اردو کا یہی کردار کھل کر ہمارے سامنے آتا ہے اور یہیں سے بحث میں انگریزی زبان داخل ہوجاتی ہے۔

ہمارے ہاں نہ صرف سرکاری ودفتری زبان انگریزی ہے بلکہ تعلیمی زبان بھی انگریزی ہے۔ حتیٰ کہ سٹیٹس کی زبان بھی انگریزی ہے ساری قوم انگریزی بولنے اور لکھنے پڑھنے پر فخر محسوس کرتی ہے۔ ہمارے ہاں انگریزی اردو کی دوغلی پالیسی کے سبب طبقاتی نظام کی بنیادیں مضبوط کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں۔ کہنے کو اردو ہماری قومی زبان ہے، یکجہتی کی علامت ہے، مسلمانوں کی برصغیر میں شناخت کا باعث ہے لیکن عملی طور پر ہر جگہ انگریزی کا چلن ہے۔ دراصل اردو کے تمام جذباتی نعرے محض عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور انہیں محکوم رکھنے کے لیے ہیں۔ انگریزی اردو، دو طبقوں یعنی حاکم اور محکوم کی تقسیم ہے۔

اگر اردو کا ہمارے معاشرے میں یہی کردار ہے کہ وہ حاکم اور محکوم کی تفریق پیدا کرنے اور ان

طبقوں کے درمیان ایک واضح فاصلہ قائم رکھنے کا کام سرانجام دے رہی ہے تو پھر معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قومی زبان کا کام، قوم کے درمیان فاصلوں کو گھٹانا ہوتا ہے، بڑھانا نہیں۔ مختلف طبقات کو قریب لانا ہوتا ہے، دور لے جانا نہیں۔

انگریزی کا برصغیر میں رائج ہونا ایک تاریخی حقیقت ہے۔ انگریز جب حکمران بن کر برصغیر میں آئے تو اپنی زبان بھی ساتھ لائے۔ حکمرانوں کی زبان ہونے کی وجہ سے انگریزی زبان کو وہی وقار حاصل ہوا جو حکمران زبانوں کو حاصل ہوا کرتا ہے۔

اور جب انگریز یہاں سے گئے تو یہ غلط ہے کہ وہ انگریزی زبان یہاں پر چھوڑ گئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے خود اسے یہاں سے جانے نہیں دیا۔ اگر چہ اس میں شک نہیں کہ ہمیں ابتداء میں انتظامی امور کے لیے انگریزی زبان کی ضرورت تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں ہمارے ہاں انگریزی زبان کو ایک مخصوص طبقے نے اپنے خاص مقاصد کے لیے استعمال کیا اور پھر اسے عوام کے استحصال کا ایک مستقل ہتھکنڈہ بنا لیا گیا۔ لہٰذا انگریزوں کے بعد یہاں جو نیا حکمران طبقہ وجود میں آیا اُس نے عوام سے فاصلہ قائم رکھنے کے لیے سرکاری سطح پر انگریزی زبان کو برقرار رکھا اور اردو زبان کی سرپرستی اسی حد تک کی جاتی رہی جس سے عوام کو محکوم رکھا جا سکے اور آج صورت حال ہمارے سامنے ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انگریزی کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے یا کیا جا رہا ہے۔ انگریزی کی ایک زبان ہونے کے ناطے حیثیت مسلم ہے۔ انگریزی نے جو ترقی پچھلے دو تین سو برسوں میں کی ہے اُس کی نظیر ملنا مشکل ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ فائدہ عوامی سطح کا ہونا چاہیے۔ علمی و ادبی سطح کا ہونا چاہیے۔ نہ کہ صرف ایک مخصوص طبقہ اس سے مادی فوائد حاصل کرتا رہے اور ریاستی امور پر قابض رہے۔ یہ جائز نہیں۔ یہ انگریزی زبان و ادب کی بھی توہین ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ انگریزی زبان میں دنیا کا بیشتر علمی سرمایہ محفوظ ہے اور جب تک ہم اپنی زبان میں وہ سارا علمی سرمایہ منتقل نہیں کر لیتے، ہمیں انگریزی زبان کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ انگریزی زبان کو اردو کی راہنمائی سونپنا ہوگی، بے شک وہ اردو زبان کی بہترین راہنما ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے تو انگریزی زبان کو فوقیت دی جا سکتی ہے مگر انگریزی کے دفتری، عدالتی اور سرکاری زبان ہونے کا ہمارے ہاں کیا جواز ہے؟ کیا یہ بھی ہماری قومی یا عوامی ضرورت ہے یا کسی مخصوص گروہ کا مفاد اس سے وابستہ ہے؟ ظاہر ہے ان سوالوں کا جواب ہمارے حکمرانوں کے پاس نہیں ہے۔

اپنی زبان میں انگریزی علمی سرمایے کو منتقل کرنے کا کام پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو جانا چاہیے تھا، تاکہ ہم جلد سے جلد انگریزی زبان کے حصار سے باہر آنے کے قابل ہوتے اور سرکاری اور انتظامی امور میں تو جس قدر جلد ممکن ہوتا انگریزی کی بالادستی سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے تھا تاکہ عوام اور حکمران دو علیحدہ طبقات میں تقسیم نہ ہو پاتے لیکن ہر سطح پر اردو کا کردار ہمیں صفر نظر آتا ہے۔

یہاں میں اپنی بات کے ایک اور پہلو کی طرف آتا ہوں۔ دراصل رابطے کی زبان کا اصل کام ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔ میری دانست میں یہ رابطے کی زبان کا اہم منصب ہے اور اسی لیے گزشتہ اوراق میں اردو کو مکمل رابطے کی زبان تسلیم نہیں کیا گیا۔

قومی زبان میں ترجمہ دو سطحوں پر ہونا چاہیے۔ ایک سطح پر مقامی زبانیں، قومی زبان میں منتقل ہوں، دوسری سطح پر بین الاقوامی زبانوں کا قومی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ قوم نہ صرف یہ کہ مقامی لوگوں سے رابطہ استوار کر سکے بلکہ پوری دنیا سے اس کا رابطہ قائم ہو سکے۔

اب یہاں تراجم کے بارے میں نہ ختم ہونے والی بحثوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ اردو میں سائنسی اور دفتری و عدالتی اصطلاحات کا ترجمہ ممکن نہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اردو اس قدر ضخیم زبان نہیں کہ مختلف مضامین کے تراجم کا بار اٹھا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارا تساہل ہے۔ اصل میں کسی زبان میں، علمی سرمایے کے اضافے کے سبب ہی ضخامت آتی ہے۔ جیسے جیسے علمی سرمایہ بڑھتا ہے، زبان ضخیم ہوتی چلی جاتی ہے۔

جب انگریزی ترقی پذیر زبان تھی تو نیوٹن بھی یہ سمجھتا تھا کہ انگریزی زبان سائنسی مضامین کو بیان کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کی تصانیف کی بڑی تعداد لاطینی زبان میں ہے۔ لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ سارا علمی سرمایہ انگریزی زبان میں محفوظ ہو چکا ہے۔ دنیا کی دوسری بڑی زبانیں مثلاً فرانسیسی، جرمن، چینی، رشین اور جاپانی وغیرہ بھی علمی سرمایے کو خود میں ڈھالنے کی اہل ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ اردو زبان اس کام کی متحمل نہیں ہو سکتی، بے معنی سی بات ہے۔ ترجمہ کا کام مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں۔ لیکن اس کے لیے ترجمہ کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ عوامی مفاد کا پیش نظر ہونا بھی ضروری ہے۔

علاوہ ازیں، ترجمے کی ظاہری مشکلات پر قابو پانے کے لیے ہمیں اس بات کی تحقیق کر لینی چاہیے کہ عربوں نے یونانی علوم کا ترجمہ کیسے کیا تھا؟ انگریزوں نے تراجم کے میدان میں کیا حکمتِ عملی اپنائی تھی؟ اس طرح ہم راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ شرط صرف نیک نیتی کی ہے۔

ہمارے ہاں آج کل انگریزی علمی و ادبی کتابوں کے تراجم اردو زبان میں چھپ رہے ہیں لیکن یہ کام محدود سطح کا ہے جبکہ ہمیں بہت سے، ایسے ''دارالتراجم'' کی ضرورت ہے جو ترجموں کا کام بہت بڑی سطح پر سرانجام دے سکیں۔

سب سے پہلے پاکستان میں موجود تمام مقامی زبانوں کو یا کم سے کم پانچ بڑی نمائندہ زبانوں کو قومی زبانوں کی حیثیت دی جانی چاہیے اور اردو کو قومی رابطے کی زبان قرار دیا جانا چاہیے۔ دفتری اور عدالتی زبان ہر علاقے میں علاقائی زبان ہو، صرف مرکز میں دفتری و عدالتی زبان اردو ہو۔ ہو سکے تو پرائمری سطح تک تعلیم مادری زبان میں ہو یا کم سے کم مادری زبان بطور زبان کے نصاب میں ضرور شامل

ہو۔ اردو میں تراجم کا کام وسیع پیمانے پر شروع ہو۔ جس میں مادری زبانوں اور بین الاقوامی زبانوں، دونوں کے تراجم بیک وقت شامل ہوں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ علمی خزانہ اردو میں منتقل ہوسکتا ہے اور یہ بہت ضروری ہے کیونکہ علمی خزانہ زبان کی اہمیت اور بقا کے عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے۔

اسی طرح اردو اس معاشرے میں اپنا واضح اور مثبت کردار ادا کرسکتی ہے۔ محض یہ کہہ دینا کہ ''ملکی سالمیت استحکام یا ملکی اتحاد کے لیے اردو زبان ضروری ہے'' مسئلہ کا حل نہیں۔ یہ محض جذباتی فقرات ہیں جن سے اردو کا ہمارے معاشرے میں کردار متعین نہیں ہوتا۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اس لیے رابطے کے لیے کسی ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے لیکن یہ بات یاد رہے کہ متحد ہونے کے لیے زبان کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ متحد لوگوں کو کسی ایک زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبانوں کے لیے قوموں کا اشتراک نہیں ہوا کرتا بلکہ اشتراک کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بعض دفعہ کسی ایک زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں تعصّبات کی بنا پر ایک زبان کے لوگوں کا اشتراک ایک الگ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب تک اردو کی رسائی اشرافیہ یا دوسرے لفظوں میں افسر شاہی نظام تک نہیں ہوتی یعنی ہمارا افسر شاہی نظام جب تک اردو کو نہیں اپناتا اور انگریزی کو راستے میں حائل کرکے عوام کو محکوم بنائے رکھنے کی پالیسی اختیار کیے رکھتا ہے، اردو کا عوامی اور معاشرتی کردار مشکوک رہے گا۔ لیکن اس کے لیے عملی اقدام کی ضرورت ہے اور ان عملی اقدام کے لیے عوامی سیاستدانوں کا وجود ناگزیر ہے۔ جبکہ موجودہ سیاسی نظام میں عوامی نمائندگان کی رسائی ممکن نہیں۔ اس کے لیے عوامی انقلاب کی ضرورت ہے اور اس انقلاب کے لیے ہمیں پھر اردو ادیبوں اور شاعروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جو اپنی انقلابی اردو سے محکوم طبقے میں انقلابی شعور پیدا کرسکتے ہیں۔

ترجمہ: نیر عباس زیدی

نیلسن مینڈیلا کا نوبیل خطبہ برائے امن

(۱۰/دسمبر ۱۹۹۳ء)

عالی مرتبت بادشاہ سلامت،
شاہی خاندان کے معزز افراد،
قابل احترام وزیر اعظم،
میڈم گرو برنڈتھ لینڈ،
وزراء کرام،
اراکینِ پارلیمنٹ اور سفراء حضرات،
نوبیل کمیٹی ناروے کے معزز ممبران،
نوبیل انعام یافتہ ساتھی جناب ایف ڈبلیو ڈی کلیرک،
معزز مہمانانِ گرامی،
دوستو، خواتین و حضرات:

میں آج یہاں امن کا نوبیل انعام وصول کرنے کے لیے کھڑا ہوں اور خود کو نہایت عاجز محسوس کر رہا ہوں۔ میں ناروے کی نوبیل کمیٹی کا دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں جنہوں نے ہمیں امن کا نوبیل انعام حاصل کرنے والوں کی صف میں شامل کیا۔ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے امن کا نوبیل انعام حاصل کرنے والے اپنے ساتھی صدر ایف ڈبلیو ڈی کلیرک کو اس اعلیٰ اعزاز پانے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آج ہم نے دو ممتاز جنوبی افریقیوں سے اپنا ناطہ جوڑ لیا، البرٹ لوتھونی اور عزت مآب آرچ بشپ ڈیسمونڈ ٹوٹو، جنہیں نسلی عصبیت کے بے ہودہ نظام کے خلاف بنیادی جدوجہد کے اعتراف کے طور پر آپ لوگوں نے امن کے نوبیل انعام سے نواز کر انہیں بجا طور پر ایک اعلیٰ مقام عطا کیا۔ یہ بات ہمارے لیے برخود غلط نہ ہوگی اگر ہم اپنے پیش رو لوگوں میں ایک اور امن کا نوبیل انعام پانے والے افریقی-امریکی سیاست دان، بین الاقوامی کارکن مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کا ذکر کریں۔ وہ بھی اس خاص مسئلہ سے برسرِ پیکار رہے اور اسی کے حل کی کوشش میں وفات پا گئے، اسی عظیم مسئلے کے حل کے لیے جس سے ہم جنوبی افریقہ کے باشندوں کو نبرد آزما ہونا پڑا۔ یہاں ہم اس چیلنج کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جو جنگ اور امن کے حوالے سے منقسم کردینے والی ہے، جارحیت اور عدم جارحیت، نسلی عصبیت اور انسانی

عظمت، جبر اور خیالات کو دبانا، آزادی اور انسانی حقوق، غربت اور ضروریات زندگی سے بےفکری۔

ہم آج یہاں ان لاکھوں لوگوں کے نمائندے کی حیثیت سے کھڑے ہیں جنہوں نے ایسے سماجی نظام کے خلاف کھڑے ہونے کی جسارت کی جس کا مقصد جنگ، جارحیت، نسل پرستی، جبر، دباؤ اور لوگوں کو مفلسی دینا ہے۔ میں آج یہاں کرۂ زمین کے ان لوگوں کی بھی نمائندگی کر رہا ہوں جو نسل پرستی کے خلاف تحریک، ان حکومتوں اور تنظیموں میں شامل ہیں جنہوں نے ہماری جدوجہد میں شمولیت اختیار کی، نہ صرف جنوبی افریقہ کے عوام کے لیے بلکہ ایک غیر انسانی نظام کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے اور انسانیت کے خلاف نسل پرستی کے ایک گھناؤنے جرم کے جلد اختتام کے لیے۔

ہمارے ملک کے اندر اور باہر بےشمار ایسے لوگ ہیں جو بغیر کسی ذاتی غرض و لالچ کے ظلم و ناانصافی کے راستے میں کھڑے ہونے کی اخلاقی جرأت رکھتے ہیں جنہوں نے یہ سمجھا کہ ایک شخص کا زخم تمام لوگوں کا زخم ہے لہٰذا اُنہوں نے انصاف اور حسنِ اخلاق کے تقاضوں کے دفاع کے لیے مشترکہ جدوجہد کی۔ ان کے اس تواتر وثبات کی وجہ سے جو کئی سالوں پر مبنی ہے، ہم آج ان تاریخوں کا تعین کر سکتے ہیں جب تمام انسانیت یکجا ہو کر اس صدی کے شاندار انسانی فتوحات کا جشن منائے گی جب وہ لمحات آئیں گے تو ہم سب مل کر نسل پرستی، نسلی عصبیت اور سفید اقلیت کی حکمرانی کے خلاف مشترکہ فتح کا جشن منائیں گے۔ یہ فتح افریقی نوآبادیاتی نظام کی اس پانچ سو سالہ تاریخ کو اختتام بخشے گی جس کا آغاز پُرتگالی سلطنت کے قیام سے ہوا۔ لہٰذا یہ تاریخ میں ایک عظیم قدم کی حیثیت سے جانا جائے گا اور یہ لوگوں کی ایک مشترکہ میراث کی حیثیت سے کام کرے گا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں نسل پرستی کے خلاف جدوجہد کریں چاہے یہ جو روپ بھی اختیار کر لے۔ براعظم افریقہ کے جنوبی سرے پر ایک تحفہ تیار ہو رہا ہے یہ انمول تحفہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے، یہ تحفہ ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے انسانیت کے نام پر قربانی دی، جنہوں نے آزادی، امن، انسانی عظمت اور انسانی تکمیل کے لیے ہر شے قربان کر دی۔ یہ تحفہ روپے پیسوں کے پیمانے میں تولنے کا نہیں نہ ہی اس کا شمار ان انمول دھاتوں اور قیمتی پتھروں میں ہوتا ہے جو افریقہ کی سرزمین میں موجود ہیں اور جو ہمارے آباؤاجداد کے قدموں تلے خاک ہوتے رہے۔ اس تحفہ کو یقیناً بچوں کی بہبود اور خوشیوں سے ماپنا چاہیے۔ بچوں کو کھلی چراگاہ میں کھیلنا چاہیے، وہ بھوک کے تکلیف دہ جذبات سے مزید ایذا نہ اُٹھائیں، بیماریوں کا شکار نہ ہوں۔ جہالت کے قہر سے خوفزدہ نہ ہوں، نہ ہی بےعزتی آزار و دست درازی کا خوف ہو اور نہ ہی ایسے کاموں میں مصروف بکار ہوں جن کی شدت ان کی ناپختہ عمر کی طلب سے تجاوز کر جائے۔

اس ممتاز مجمع کے سامنے ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم نئے نوبی افریقہ کو اس کٹھن مقصد کے حصول کی کوشش میں لگا دیں گے جو عالمی اعلامیے میں بقا، تحفظ اور بچوں کی ترقی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ تحفہ جس کے متعلق ہم نے گفتگو کی ہے اس کی قیمت کا اندازہ ان بچوں کے ماں باپ کی بہبود اور خوشی کی

صورت میں کرنا چاہیے، جو روئے زمین پر راہزنی کے خوف کے بغیر گھوم پھر رہے ہیں، بغیر اس خوف کے کہ وہ سیاسی یا مادی مفاد کی خاطر قتل کر دیئے جائیں گے یا انہیں اس لیے حقارت سے دیکھا جائے گا کہ وہ گداگر ہیں۔ انہیں نااُمیدی کے بھاری بوجھ سے بھی نجات ملنی چاہیے جو وہ اپنے دلوں میں لیے پھرتے ہیں، بھوک، افلاس، بےگھر ہونا اور بےروزگار رہونا۔ اس تحفہ کا اندازہ قربانیاں دینے والے لوگ ہمارے ملک کے تمام لوگوں کی خوشی اور بہبود سے کر سکتے ہیں، جنہوں نے خود کو تقسیم کر دینے والی غیر انسانی دیواروں کو روند دیا ہوگا۔ ان عظیم سپوتوں نے انسانی عظمت کی شدید ذلّت کی طرف اپنی پشت کر لی ہوگی، وہ ذلت جو کچھ لوگوں کو آقا اور کچھ کو غلام بتاتی ہے اور کسی کو ایک غارت گر کی حیثیت میں تبدیل کرتی ہے جس کی بقا دوسرے کی تباہی میں پنہاں تھی۔ ہمارے مشترکہ تحفہ کی قدر و قیمت کا اندازہ اس خوشیوں بھرے امن سے لگایا جا سکتا ہے جس کی فتح یقینی ہے کیونکہ انسانیت کالے اور گورے دونوں کو ایک انسانی نسل میں پروتی ہے، جس نے ہمیں درس دیا ہوگا کہ ہمیں جنت کے بچوں کی طرح رہنا چاہیے۔ ہم اسی طرح رہیں گے کیونکہ ہم نے ایک ایسا معاشرہ بنا لیا ہوگا جس کا یہ نظریہ ہے کہ تمام لوگ پیدائشی طور پر ایک جیسے ہی ہیں، ہر شخص کو زندگی کے تمام پہلوؤں پر استحقاق برابری کی سطح پر ہے جن میں آزادی، خوشحالی، انسانی حقوق اور اختیار شامل ہیں۔ اس طرح معاشرہ آئندہ یہ مہلت نہ دے گا کہ اس میں ''ضمیر کے قیدی'' ہوں یا کسی بھی فرد کے بنیادی انسانی حقوق پائمال کیے جائیں۔ اب کبھی ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ پُرامن تبدیلی کے لیے حل تلاش کرنے کے راستے غاصبین کے ہاتھوں رک جائیں۔ وہ غاصبین جو اپنے شرمناک مقاصد کے حصول کی خاطر لوگوں سے طاقت وقوت چھین لینا چاہتے ہیں۔

انہی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم برما کے حکمرانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ امن کا نوبیل انعام حاصل کرنے والی ہماری ساتھی اونگ سین سوکائی کو رہا کر دیں اور برما کے لوگوں کے واضح مفاد کی خاطر، ان لوگوں کی خاطر جن کی وہ نمائندگی کرتی ہیں، سنجیدہ مذاکرات کے ذریعے اس مسئلے کا حل تلاش کریں۔

ہم دعا گو ہیں کہ جن لوگوں میں ایسا کرنے کا اختیار ہے وہ فوراً انہیں اس قابل بنا دیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو اپنے ملک کے عوام اور ساتھ ہی دیگر عوام کے لیے بروئے کار لائیں۔ اپنے ملک کی غیر منظّم اور بےہنگم سیاست سے ہٹ کر اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں ناروے کی نوبیل کمیٹی کے ساتھ مل کر اپنے ساتھی مسٹر ایف ڈبلیو ڈی کلیرک کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ ان کے اندر یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ ہے کہ ہمارے ملک اور عوام کے ساتھ نسل پرستی کے نظام کے اطلاق سے ایک سنگین غلطی کی گئی ہے۔ ان کے اندر سمجھنے اور تسلیم کرنے کی پیش بینی ہے کہ جنوبی افریقہ کے عوام کو اس عمل کے شریک کی حیثیت سے مذاکرات کر کے اپنے مستقبل کا تعین کرنا چاہیے لیکن اب بھی ہمارے ملک میں ایسے لوگ ہیں جو غلط طور پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ روایتی طریقوں سے چمٹے رہ کر بھی امن وانصاف کے مقاصد کے لیے کام کر سکتے ہیں حالانکہ ایسا کرنے سے محض تباہی ہی ہوئی ہے۔ ہم اس بات سے بھی

پُر اُمید ہیں کہ یہ لوگ بھی مناسب دلائل کے ذریعے یہ حقیقت جان لیں گے کہ تاریخ کو رَد نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ کتنی ہی عمدگی اور لبھاؤ کے ذریعے نئی شکل میں پیش کرنے کے باوجود بھی بے جوڑ ماضی کو از سرِ نو ترتیب دے کر نئے معاشرے کا قیام وجود میں نہیں آ سکتا۔ ہم اس امید پر جی رہے ہیں کہ جنوبی افریقہ اپنی تعمیرِ نو کی جنگ لڑ رہا ہے اور یہ مسلسل جدوجہد سے وجود میں آنے والی ایک نئی دنیا کے لیے اکائی ثابت ہوگا۔ یہ ایک ایسی دنیا ہونی چاہیے جس میں جمہوریت اور انسانی حقوق کی پاسداری ہو، ایک دنیا جو غربت، افلاس، بھوک، محرومیوں اور جہالت کے خوف سے آزاد ہو جو خانہ جنگی اور بیرونی جارحیت کے خطرات سے مُبرا ہو، جس کو اس المیہ کا بھی خطرہ نہ ہو کہ لاکھوں لوگوں کو زبردستی ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ وہ مراحل جن سے جنوبی افریقہ اور افریقہ کے دیگر جنوبی ممالک گزر رہے ہیں وہ ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں اور ہم سے متقاضی ہیں کہ یہ ہم سب اس سیلاب کے رُخ سے فائدہ اُٹھائیں اور اس خطے کو ایک زندہ مثال بنا دیں۔ ہم اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ یہ نوبیل انعام ان معاملات کی ستائش کے لیے مختص ہے جو وقوع پذیر ہوئے اور گزر گئے۔ ہم ان لوگوں کی آوازیں سنتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ تمام تر کائنات سے یہ اپیل ان لوگوں کی ہے جنھوں نے نسل پرستی کے نظام کے خلاف جستجو کی۔ ہم ان کی پکار کو سمجھ سکتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کا بچا کھچا اپنے ملک کے انمول اور دردناک تجربے کے لیے وقف کر دیں اور ہم عملی مظاہرہ کریں کہ انسانی بقا کی روایتی صورت جمہوریت، انصاف، امن، نسل پرستی اور جنس پرستی سے گریز، ہر شخص کی خوشحالی، صحت مند ماحول، مساوات اور لوگوں کی یک جہتی ہی میں ہے۔

اس اپیل سے متاثر ہو کر اور اس اعزاز سے تحرک حاصل کر کے جو آپ نے ہمیں بخشا، ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم بھی اپنی دنیا کی تجدید کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کر گزریں تاکہ مستقبل میں روئے زمین پر کوئی بھی شخص نامراد نہ کہلوایا جائے۔ آنے والی نسلیں یہ کبھی نہ کہہ سکیں کہ بے توجہی، آدم بیزاری یا خود غرضی نے ہمیں ان بہترین تصورات پر زندگی گزارنے سے دُور رکھا جن کی نمائندگی امن کا نوبیل انعام کرتا ہے۔

آیئے ہم سب کی کوششیں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے اس قول کو درست ثابت کر دیں کہ انسانیت اب جنگ اور نسل پرستی کی اندھیری رات کی المیہ گرفت میں نہیں رہ سکتی۔ آیئے ہم تمام لوگوں کی کاوشیں یہ ثابت کر دیں کہ وہ شخص محض خواب کی باتیں نہیں کرتا تھا کہ جب وہ یہ کہتا تھا کہ حقیقی امن اور بھائی چارہ سونا، چاندی اور ہیرے سے زیادہ قیمتی ہے۔ آیئے دعا کریں کہ ایک نئے دور کا سورج طلوع ہو۔

پُوسونگ لنگ/شگفتہ حسین

رکشاس کے باسی اور سمندری مارکیٹ

(چینی کہانی)

مأ جی، جس کا دوسرا نام لونگ می تھا، ایک تاجر کا بیٹا تھا۔ خوبصورت وجیہہ، شکیل، ریتوں، روایتوں سے ہٹ کر زندگی گزارنے والا غیر روایتی سا نوجوان--- ناچنے گانے سے تو اسے عشق تھا۔ جب بھی کوئی تھیٹر میلہ ہوتا، وہ اداکاروں میں گھل مل جاتا اور پھر--- سر پر ریشمی رومال باندھے پھرنے کی انوکھی ادا اسے کسی نوخیز نازک حسینہ کی مانند حسین بنا دیتی۔ انھی اداؤں اور حسن و جمال کے سبب وہ ''خوش رُو'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں انتظامی امور کی تعلیم کے لیے وہ نظامتِ خصوصی کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ جہاں اپنی خداداد ذہانت سے اس نے خوب نام کمایا۔ ابھی وہ شہرت کی بلندیاں طے کرنے میں مصروف تھا کہ اس کے باپ نے بڑھاپے کی آمد آمد جانتے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کیا۔

''بیٹا'' بوڑھے آدمی نے کہا، ''کتابیں تمھیں علم دیتی ہیں، لیکن بھوکے پیٹ کو کھانا یا ننگے جسم کو لباس مہیا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنے باپ کا پیشہ اپناؤ۔''

باپ کی حسبِ خواہش مأ نے آہستہ آہستہ تجارت سے ناطہ جوڑ لیا۔ ایک مرتبہ جب وہ دوسرے تاجروں کے ساتھ مل کر ایک سمندری سفر پر گیا تو راستے میں انہیں سمندری طوفان نے آ لیا۔ بپھری موجوں نے ما کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ کئی دن کئی راتیں مأ بھٹکتا پھرا اور آخر کار ایک شہر میں جا پہنچا۔ اس شہر کے رہنے والے عجیب و غریب انسان تھے؛ خوفناک کریہہ المنظر؛ لیکن جیسے ہی انہوں نے مأ کو دیکھا وہ سب خوف سے چیخنے اور اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، گویا وہ کوئی جن بھوت ہو۔ پہلے تو مأ ان کی مہیب صورتوں سے دہشت زدہ ہو گیا لیکن جیسے ہی اسے یہ احساس ہوا کہ وہ لوگ اس سے بھی زیادہ اس سے خوفزدہ ہیں، اس نے اِس صورتِ حال سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ انہی کے درمیان رہنے لگا اور جب کبھی بھی وہ انہیں کھاتے پیتے دیکھتا، ہاؤ ہو کرتا تیزی سے ان کی طرف بڑھتا اور جب وہ دہشت زدہ ہو کر خوف کے عالم میں بکھر جاتے تو ان کا چھوڑا کھانا سارے کا سارا سمیٹ لیتا۔

کچھ دن ان لوگوں کے خوف کا فائدہ اٹھانے کے بعد مأ نے ایک پہاڑی گاؤں کا رخ کیا۔ وہاں کے لوگوں کی شکلیں کسی حد تک انسانوں جیسی تھیں۔ لیکن وہ چیتھڑوں میں لپٹی مفلوک الحال قوم تھی۔ مأ تھکا ہوا تو تھا ہی، ستانے کی غرض سے ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا، ایسے میں گاؤں والے کافی فاصلے پر کھڑے اسے گھورتے رہے، لیکن اس کے قریب آنے کا حوصلہ کسی میں نہ تھا۔ آخر جب انہیں یقین ہو گیا، وہ انہیں کچا چبا کر نہیں کھائے گا تو آہستہ آہستہ اس کے قریب آ گئے۔ مأ نے ان کا خوف

دور کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے انہیں مخاطب کیا، جواب میں وہ لوگ بھی اپنی زبان میں اس سے کچھ کہنے لگے۔ دونوں اپنی اپنی ہانک رہے تھے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی سمجھ انہیں آ ہی گئی۔ اسی ٹوٹے پھوٹے رابطے میں جب مأ نے انہیں بتایا کہ وہ چین سے آیا ہے تو وہ مارے خوشی کے کھل اٹھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے گاؤں میں یہ خبر پھیلا دی گئی کہ اجنبی کم از کم کینی بال نہیں ہے۔ البتہ ان میں جو انتہائی کریہہ المنظر تھے وہ مأ سے بدستور ہیبت زدہ رہے۔ انہوں نے مأ کو ایک نظر تو دیکھا لیکن پاس آنے کی جرات نہ کی۔ جو مأ سے مخاطب ہوئے ان کے نقوش تقریباً چینیوں جیسے تھے۔ وہ لوگ جب مأ کے لیے کھانا اور شراب لائے تو مأ نے پوچھا کہ وہ اس سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں اور چین کے ذکر پر خوش کیوں ہوئے؟

''ہمیں ہمارے بڑوں نے بتایا تھا'' انہوں نے جواب دیا ''کہ ہمارے مغرب میں تقریباً نو ہزار میل کے فاصلے پر ایک ملک چین کہلاتا ہے۔ جس میں غیر معمولی شکل وصورت کی ایک قوم آباد ہے۔ اس سے پہلے ہمیں صرف سنی سنائی کا علم تھا لیکن اب تمہاری صورت میں ہمیں ثبوت بھی مل گیا ہے۔''

مأ نے ان سے ان کی غربت کا سبب پوچھا تو کہا، ''ہمارے ملک میں ادبی کمالات اور ذہانت کے بجائے خوبصورتی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ترقی کا معیار ذہنی صلاحیتیں نہیں، خوبصورت ہونا شرط ہے۔ ہم میں جو سب سے زیادہ خوبصورت ہیں انہیں وزیر کا عہدہ دیا جاتا ہے، جو ان سے کم خوبصورت ہوں وہ گورنر اور مجسٹریٹ مقرر ہوتے ہیں جبکہ تیسرے درجہ کے خوبصورت لوگ اگر طبقۂ امراء سے ہوں تو ولی کے درجے پر فائز ہوتے ہیں اور اپنے خاندان کی کفالت کے لیے شاندار پنشن پاتے ہیں۔ لیکن ہم جیسے بدصورت لوگوں کو پیدائش سے ہی خوفناک غیر فطری مخلوق قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہمارے والدین تقریباً ہمیشہ کے لیے ہم سے دست بردار ہو جاتے ہیں لیکن ہمیں صرف اس لیے زندہ رہنے دیتے ہیں کہ خاندان کی نسل چلتی رہے وگرنہ ہمارا کوئی مصرف نہیں۔''

اور پھر جب مأ نے ان سے ان کے ملک کا نام دریافت کیا تو اپنوں کے برے سلوک کے باوجود اسے فخر سے بتایا گیا۔ یہ ''رکشاس کی مملکتِ عظیم الشان'' ہے اور یہ بھی کہ ان کا دارالحکومت شمال میں تقریباً دس میل کی دوری پر واقع ہے۔ بے چارے!!

مأ نے فوراً وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا، وہ تو جیسے تیار بیٹھے تھے۔ دوسرے ہی دن مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ سب دارالحکومت کی طرف روانہ ہو گئے۔ پو پھٹے یہ مختصر سا قافلہ شہر پہنچ گیا۔ شہر کی دیواریں سنگِ سیاہ کی تھیں، ساتھ ہی سو سو فٹ اونچے مینار اور ستون بھی تعمیر کئے گئے تھے جبکہ فرش سنگِ سرخ کا تھا۔ مأ نے جھک کر ایک سنگریزہ اٹھایا تو اس کی انگلی کے ناخن پر شنگرفی نشان پڑ گیا۔ بس وہ بھلے وقت میں وہاں پہنچے تھے، کیونکہ درباری زندگی بیدار ہو رہی تھی اور وہ افسروں کو فوجی ساز وسامان سے خود کو سجاتے دیکھ سکتے تھے۔ گاؤں والوں نے اشارے سے اُسے اپنا وزیر اعظم بھی دکھایا۔

''افوہ وہ کیسی ہیبت ناک مخلوق تھی'' ہاتھی جیسے یہ بڑے بڑے کان تین نتھنے اور پلکیں کسی چھپر

کی طرح اس کی آنکھوں کو ڈھانپے تھیں۔ کچھ گھڑ سوار وزیر اعظم کے پیچھے تھے وہ وزیر اعظم کی منتخب کردہ مشاورتی کونسل کے معزز ارکان تھے۔ گاؤں والوں نے مأ کو ہر شخص کے عہدے کے بارے میں بتایا اور مأ نے جانا کہ یوں تو وہ سبھی بے حد بدصورت تھے لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ جس کا جتنا عہدہ کم تھا اتنا ہی وہ کریہہ المنظر بھی کم تھا۔ مأ واپسی کے لیے مڑا تو دارالحکومت کے لوگوں نے مارے خوف کے چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ وہ سب اُسے دیکھ کر مختلف سمتوں کو بھاگ کھڑے ہوئے گویا وہ کوئی خوفناک آدم خور دیو ہو۔ صرف جب گاؤں والوں نے انہیں یقین دلایا کہ مأ سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تب ان کی جان میں جان آئی اور انہوں نے اتنی ہمت کی کہ کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ جب تک مأ گاؤں والوں کے ساتھ واپس ہوا، پورے ملک میں کوئی عام بندہ ایسا نہ تھا جو نہ جانتا ہو کہ ان کے ملک میں ایک عفریت آیا ہوا ہے۔ امرأ و شرفا کو بھی اسے دیکھنے کا تجسس ہوا اور انہوں نے گاؤں والوں کو مأ کو لانے کی ہدایت کی۔ لیکن یہاں عجب تماشا ہوا۔ وہ جس گھر جاتے دربان دروازہ مأ کے منہ پر دے مارتا۔ گھروں میں چھپے لوگوں کی یہ کیفیت کہ خوف کے مارے کھڑکیوں، دروازوں کی جھریوں سے جھانک رہے ہیں، سرگوشیوں میں تبصرے بھی جاری ہیں لیکن اتنی جرأت نہیں کہ اسے اندر آنے کی دعوت دیں۔ اس عجیب وغریب صورتِ حال میں آخر گاؤں والوں کو ایک شخص یاد آیا اور انہوں نے مأ کو بتایا، ''یہاں شاہی گارڈ کا ایک کپتان ہے، جسے ہمارے پہلے مرحوم بادشاہ نے کئی ایک مہمات پر غیر ممالک میں بھیجا تھا۔ اس نے اتنی دنیا دیکھ رکھی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے خوف زدہ نہ ہو۔''

وہ مأ کو لیے کپتان کے پاس پہنچے۔ کپتان کو مأ سے مل کر سچی خوشی ہوئی۔ اس نے کسی معزز مہمان کی طرح اسے خوش آمدید کہا۔ مأ نے دیکھا کہ اس کا میزبان جو کم از کم نوے سال کا بڈھا آدمی تھا، اس کی آنکھیں گویا ابلی پڑتی تھیں اور داڑھی ایسی جیسی خار پشت کی ہوتی ہے۔ ''اپنی جوانی میں''، کپتان نے کہا، ''مرحوم بادشاہ سلامت نے مجھے کئی ایک ممالک میں بھیجا لیکن بدقسمتی سے کبھی چین جانے کو نہ کہا۔ اب ایک سو بیس سال کی عمر میں، میں بہت خوش قسمت ہوں کہ تمہارے معزز ملک سے آنے والے ایک شخص سے مل رہا ہوں۔ مجھے تمہارے بارے میں بادشاہ سلامت کو ضرور خبر کرنا چاہیے۔ مجھے دربار چھوڑے دس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے، میں کبھی دربار میں نہیں گیا، لیکن اب تمہاری خاطر میں کل علی الصبح وہاں جاؤں گا۔'' کپتان نے مأ کے سامنے کھانوں اور مشروبات کا خوب اہتمام کیا اور جب وہ شراب کے کئی جام چڑھا چکے تو تقریباً درجن بھر لڑکیاں رقص کرنے اور گیت گانے کے لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔ شکل وصورت سے تو وہ بالکل شیطان کی بہنیں لگ رہی تھیں لیکن اپنے تئیں خوب سجی سنوری تھیں۔ انہوں نے سروں کے گرد سفید ریشمی رومال لپیٹ رکھے تھے اور تن پر خوبصورت لمبے سرخ چغے تھے، جن کے کنارے فرش کو چھو رہے تھے۔ وہ کیا گا رہی تھیں، کیسا ناچ رہی تھیں، مأ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس کے لیے ان کی موسیقی قطعی فضول اور دقیانوسی تھی لیکن اس کا میزبان ان کے ناچ گانے میں مست

جھوم رہا تھا۔ ''محفل موسیقی'' کے اختتام پر اس نے مأ سے پوچھا کہ جیسی شاندار موسیقی ہماری ہے، کیا چین والے ایسی موسیقی کے لیے ہماری برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مثبت جواب ملنے پر بوڑھے آدمی نے درخواست کی کہ وہ کسی چینی گیت کی چند سطریں گنگنائے۔ چنانچہ اس پر احسانِ عظیم کرتے ہوئے، میز پر دھن بجاتے مأ نے ایک گیت گنگنانا شروع کیا۔

اوہو! حیرت انگیز!! کپتان نے چلا کر کہا، ''یہ تو کسی ققنس یا ڈریگن کی چیخ و پکار جیسی موسیقی ہے۔ اس سے پہلے میں نے اس سے ملتی جلتی کوئی چیز کبھی نہیں سنی۔'' لیکن وہ مأ کے گانے سے محظوظ ضرور ہوا تھا۔

اگلے دن بڈھا کپتان مأ کی سفارش کے لیے شاہی دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے، مأ کو شرف حضوری بخشنے کا فیصلہ کیا لیکن دو وزیروں نے اعتراض کیا کہ مأ کی نفرت انگیز اور گھناؤنی شکل وصورت بادشاہ سلامت کی طبع نازک پر گراں گزرے گی۔ چنانچہ بادشاہ نے وہیں اپنا ارادہ بدل دیا۔ مایوس و پریشان کپتان مأ کے پاس لوٹ آیا۔

خیر دن یونہی گزرتے رہے۔ مأ کپتان کا مہمان تھا اور وہ مأ کا خوش وضع میزبان۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ دونوں شراب نوشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نشے کی مستی میں مأ نے اپنے چہرے کو کوئلوں کی کالک سے سیاہ کیا اور لگا ژینگ فی (۱) کے کردار میں تلوار ڈانس دکھانے۔ ''واہ واہ۔ بہت خوب'' کپتان خوشی سے چیخا۔ اسے مأ کا یہ بہروپ بہت پسند آیا تھا۔ اس نے فوراً منصوبہ بنایا کہ وزیر اعظم کے سامنے مأ کو اسی طرح چہرے پر کالک مل کر پیش ہونا چاہیے۔ ''وہ یقیناً تمہاری سرپرستی کرے گا اور تمہیں ایک بڑی تنخواہ بھی دے گا۔''

''نہیں جناب نہیں۔ محض دل لگی کے لیے تو ایسا بہروپ بھرا جا سکتا ہے'' مأ نے ایک قہقہے کے ساتھ احتجاج کرتے ہوئے کہا، ''لیکن ذاتی فائدے کے لیے نہیں-- جناب میں منافق کا کردار کیسے ادا کر سکتا ہوں؟''

کپتان مصر رہا اور مأ کو مانتے ہی بنی۔ تب کپتان نے کچھ اعلیٰ حکام کے اعزاز میں ایک ضیافت کا انتظام کیا اور مأ سے کہا کہ وہ اپنے چہرے کو سیاہ کیے تیار رہے۔ مہمان آئے تو مأ کے سیاہی پتے چہرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ''حیرت انگیز'' وہ سب چلائے، ''ارے یہ پہلے تو گندی صورت کا آدمی تھا، لیکن اب کیسا
خوبصورت بانکا نظر پڑتا ہے۔''

شراب کے دور چلے تو وہ سب جلد ہی ایک دوسرے کے دوست بن گئے اور جب اسی حلیے میں مأ نے مقامی گیت سنائے، رقص کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ فوراً ہی اگلے دن ان کی سفارش پر بادشاہ نے اسے دربار میں حاضری کا حکم صادر کر دیا تا کہ چینی حکومت کے بارے میں سوال جواب کیے جا سکیں۔ مأ بھی بڑا سیانا تھا موقع محل کی مناسبت سے بادشاہ کو ایسے جواب دیئے کہ اس نے خوش ہو کر اپنے ''عیش محل'' میں مأ کے اعزاز میں ایک شان دار، ضیافت کا حکم دیا جس میں تمام اکابرین سلطنت کو مدعو کیا گیا تھا۔

''ہم نے سنا ہے کہ تم موسیقی میں مہارت رکھتے ہو، نوجوان''، بادشاہ نے کہا، ''کیا تم مابدولت کی خاطر کوئی گیت گنگنا سکتے ہو''؟

مأ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ لڑکیوں کی نقل میں سر پر سفید رومال لپیٹا اور لگا بازاری دھنیں بجانے۔ بادشاہ ''فن'' کے اس ''شاندار'' مظاہرے سے بے حد متاثر ہوا اور مأ کو اپنا مشیر خاص بنا لیا۔ اب وہ اکثر رات کا کھانا مأ کے ساتھ کھاتا تھا۔ بادشاہ کے حکام کے لیے یہ غیر معمولی نوازش تھی۔ دوسرے وقت گزرنے کے ساتھ انہوں نے جان لیا تھا کہ مأ نے اپنے چہرے پر کوئلوں کی سیاہی مل رکھی ہے، چنانچہ لوگ اسے دیکھ کر چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے یا اس سے سرد مہری سے پیش آتے؛ ایسے میں مأ خود کو تنہا تنہا محسوس کرتا، تنہائی کا یہ احساس اسے بے چین کر دیتا۔ آخر اس نے بادشاہ سلامت کے حضور شرفِ قدم بوسی کی درخواست گزاری اور عرض کی کہ اب اسے شاہی دربار کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے، لیکن بادشاہ نے انکار کرتے ہوئے صرف اس امر کی اجازت دی کہ وہ صرف تین ماہ کے لیے دربار سے چھٹی لے سکتا ہے۔ تب مأ ایک بگھی میں ڈھیروں سونا اور جواہرات بھرے پہاڑی گاؤں کی طرف واپس ہوا۔ گاؤں والوں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اسے خوش آمدید کہا؛ مأ ان مظلوم لوگوں کی بُری حالت سے بہت متاثر تھا، اس نے تالیوں کی گونج میں سارے ہیرے جواہرات اپنے پرانے دوستوں میں تقسیم کر دیئے۔

''ہم تو حقیر سے لوگ ہیں، جناب'' انہوں نے کہا ''پھر بھی حضور نے ہم سے ایسا مہربانی کا سلوک کیا۔ جب ہم سمندری مارکیٹ میں جائیں گے تو اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے آپ کے لیے وہاں سے قیمتی چیزیں تلاش کر کے لائیں گے''۔ مأ کو اس مارکیٹ کے بارے میں تجسس ہوا۔ پوچھنے پر بتایا ''سمندر کے بیچوں بیچ یہ مارکیٹ واقع ہے، جہاں سمندر کے بیٹے تمام سمندروں سے اپنے جواہرات لے کر آتے ہیں۔ اسی طرح اردگرد کے بارہ ملکوں سے تاجر بھی تجارت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ یہاں رنگین بادلوں اور شوخ و شریر موجوں کے درمیان موجود دیوی دیوتا اٹھکیلیاں کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن بزدل امیر آدمی اور اعلیٰ حکام اس سمندری سفر کا خطرہ مول نہیں لیتے، اس کے بجائے وہ ہمیں معاوضہ دیتے ہیں کہ ہم ان کے لیے خزانے خرید کر لائیں۔ سمندری مارکیٹ لگنے کا وقت اب قریب ہے۔''

''تمہیں تاریخ کا کیسے پتہ چلتا ہے؟'' مأ نے پوچھا۔

بولے، مارکیٹ لگنے سے سات دن پہلے سرخ پرندے سمندر کے اُوپر اُڑنا شروع کر دیتے ہیں، لیکن جب مأ نے ان سے پوچھا کہ وہ کب سفر کا آغاز کریں گے اور کیا وہ ان کے ساتھ جا سکتا ہے، تو گاؤں والوں نے منت کرتے ہوئے اس سفر سے باز رہنے کو کہا۔

''بھائی میں ایک ملاح ہوں'' مأ نے احتجاج کیا، ''یہ تیز ہوائیں، یہ شوریدہ سر موجیں میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں، میں ان سے خوف زدہ نہیں ہوں۔'' جلد ہی لوگ چیزیں خریدنے کے لیے ساحل کنارے جمع ہو گئے۔ گاؤں والوں نے بھی اپنا سامان اکٹھا کیا اور ایک بڑی کشتی میں سوار ہو گئے۔ یہ ایک

مسطح پیندے کے ساتھ اونچے اونچے جنگلے والی اتنی بڑی کشتی تھی جس میں درجنوں آدمی سما سکتے تھے۔ دس آدمی چپو چلانے والے تھے اور یہ کسی تیر کی طرح پانی کو چیرتی بڑھی چلی جاتی تھی۔ تین دن کے سفر کے بعد اُنہوں نے تیرتے بادلوں اور بہتے پانی کے درمیان فاصلے سے دیکھا تو ایک کے بعد ایک اُبھرتے ڈوبتے خیمے نظر پڑے جب کہ تجارتی قافلوں کی بھی آمد آمد تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ایک شہر میں پہنچے، جس کی دیواریں قدِ آدم اینٹوں سے بنی تھیں اور آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ایک قلعہ تھا۔ اُنہوں نے یہاں اپنی کشتی لنگر انداز کی اور مارکیٹ میں سجی قیمتی چیزوں کا جائزہ لینے کے لیے ساحل کی طرف روانہ ہوگئے۔ واہ! وہاں تو نگاہوں کو خیرہ کرتے قیمتی پتھر سجے تھے، ایسے پتھر بھلا انسانوں کی دنیا میں کہاں!! تب ایک جوان آدمی گھوڑے پر سوار آیا اور مارکیٹ کے سبھی لوگ جلدی جلدی راستہ دیتے پیچھے ہٹنے لگے، شور مچاتے ہوئے--''یہ ڈونگ ینگ کا تیسرا شہزادہ ہے، یہ ڈونگ ینگ کا تیسرا شہزادہ ہے۔'' اور شہزادے نے مأ کو دیکھا تو حیرت سے چلایا، ''ارے۔ یہ اجنبی کون ہے؟ یہ ان علاقوں سے تو نہیں۔'' شہزادے کے حکم پر مصاحبوں نے مأ سے دریافت کیا کہ وہ کس دیس کا باسی ہے؟ مأ سڑک پر ہی تعظیماً شہزادے کے سامنے دوزانو ہوگیا۔ اس نے جب چین کا ذکر کیا تو شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا ''نوجوان، یقیناً یہ ہماری خوش بختی ہے کہ تم ہماری دنیا کی سیر کے لیے آئے ہو۔'' شہزادے نے مأ کو ایک گھوڑے پر سوار کرایا اور اپنے ساتھ مغربی دروازے سے باہر چلنے کا حکم دیا۔ ساحل پر پہنچے تو گھوڑے ہنہنائے اور سمندر کی موجوں میں اُتر گئے۔ مأ خوفزدہ ہوگیا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ سمندر دو حصوں میں منقسم ہوگیا ہے اور دائیں بائیں شفاف پانی کی دیواریں کھڑی ہیں، فوراً ہی ایک محل نظروں کے سامنے آگیا۔ یہ محل سمندری دنیا کے فنِ تعمیر کا شاہکار تھا۔ محل کی چھت کچھوے کے خول سے بنی تھی اور فرش مچھلی کے چانوں سے، جب کہ چمکدار کرسٹل سے بنی خیرہ کن دیواریں چہار جانب اپنا عکس ڈال رہی تھیں۔ وہ گھوڑوں سے اُترے اور مأ کو لیے ڈریگن بادشاہ کے حضور حاضر ہوئے۔

''شہنشاہِ معظم! آج سمندری مارکیٹ میں مجھے ملک چین کے ایک ذہین وفطین آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔'' شہزادے نے بادشاہ کے گوش گزار کیا۔ ''اور میں اسے آپ کے حضور پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔''

تب مأ آگے بڑھا اور تعظیم بجالایا۔ ''نوجوان، تم ایک عظیم عالم فاضل انسان ہو۔'' بادشاہ نے کہا ''یقیناً چو ہو آن، سونگ ہو اور دوسرے قدیم شاعروں سے کسی طور پر کم نہیں ہو، کیا تم ہماری سمندری مارکیٹ کے بارے میں چند اشعار نظم کرسکتے ہو؟'' مأ نے سر جھکا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ شاہی حکم پر اسے کرسٹل کی سیاہی کی دوات، ڈریگن کی داڑھی سے بنا قلم، برف سا سفید کاغذ اور گلابوں جیسی خوشبودار سیاہی فوری مہیا کی گئی۔ کوئی تامل کیے بنا اس نے ایک ہزار کرداروں کے بارے میں اشعار کہہ ڈالے اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیئے۔ نظم کے اشعار اور زیر و بم سے متاثر بادشاہ بے ساختہ پکار اُٹھا، ''نوجوان، تمہاری ذہانت

نے ہماری آبی سلطنت کو جگمگا دیا ہے۔ آج رات ہمارے قصرِ گل سحاب میں اس نوجوان کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا جائے اور ہمارے تمام ڈریگن رشتے داروں کو شرکت کی ہدایت کی جائے۔''

کھانے کے بعد شراب کا دورِ عام چلا تو ایک ہاتھ میں جام کو فضا میں بلند کرتے ڈریگن بادشاہ نے مأ سے کہا ''ہماری عزیز از جان بیٹی ابھی تک غیر شادی شدہ ہے، اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہماری خواہش ہے کہ اسے تمہارے عقد میں دے دیا جائے۔''

مأ ایک دم اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا، خوشی اور شرم سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ لڑکھڑاتی زبان میں اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور اپنی خوش بختی پر نازاں اس شاہی نوازش کو قبول کرلیا۔ ڈریگن بادشاہ نے حاضر باش خدمت گاروں کو اشارہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد شاہی کنیزوں کے جلو میں نازک بدن، ہواؤں پر قدم دھرتی شہزادی اندر داخل ہوئی۔ اس کی ہر ہر جنبش سے اس کے کانوں کے آویزے سبزی مائل نیلگوں رنگ بکھیرتے تھے۔ مأ نے چوری چوری اپنی دلہن کو دیکھا تو اس کے ملکوتی حسن سے مسحور ہوگیا۔ شادی کی تقریب کے لیے ڈھول تاشے بجنے لگے، مبارک سلامت کا شور ہوا اور مأ، ماورائی حسن کی مالک شہزادی کا شوہر بن گیا۔ تقریب کے بعد شہزادی اپنی کنیزوں کے ہمراہ رخصت ہوگئی تو دو خواصیں ہاتھوں میں رنگین شمعیں تھامے حاضر ہوئیں اور مأ کو محل کے اندر لے چلیں۔ خواب گاہ میں شہزادی مأ کی منتظر تھی۔ دلہن کا بستر شاندار وضع سے سجایا گیا تھا۔ مونگوں اور مرجان سے بنا پلنگ جواہرات ٹکا تھا، پردے رنگین پروں سے آراستہ تھے، چاروں طرف موٹے موٹے موتیوں کی جھالریں لٹکتی تھیں اور بستر___ بستر نرم، گداز، خوشبوؤں میں ڈوبا تھا۔

اگلے دن صبح ہی صبح کھلکھلاتی کنیزیں شہزادی کی خدمت کے لیے آموجود ہوئیں۔ مأ بھی تیار ہوکر بادشاہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے دربار میں حاضر ہوا۔ شاہی آداب و رسوم کے مطابق اسے بادشاہ کے داماد کی حیثیت سے مسند نشین کیا گیا اور بادشاہ نے اسے اعلیٰ شاہی منصب وخلعت سے نوازا۔ اس کی نظم کی کاپیاں تمام آبی سلاطین کو بھیجی گئیں۔ جواب میں مختلف سمندروں کے ڈریگن شاہوں نے خصوصی سفیر مأ کے سُسر کی خدمت میں بھیجے جو مبارکباد کے ساتھ دعوتوں کے پیغام بھی لائے تھے۔

تب مأ بادشاہ کے حکم سے خوبصورت عبا زیب تن کیے، ایک سبز سینگوں والے ڈریگن پر سوار آبی سلطنتوں کے دورے پر روانہ ہوا۔ ساتھ میں شاندار اسلحہ لگائے گھوڑوں پر سوار درجنوں بانکے بھی تھے، جن کے کندھوں پر نقش ونگار سے مزین کمانیں اور ہاتھوں میں سفید عصائے حکومت تھے۔ ان چمکتے دمکتے سواروں کے علاوہ گھوڑوں اور رتھوں پر سوار، بربط اور بانسریوں پر میٹھی دھنیں بکھیرتے موسیقار بھی مأ کے جلوس میں شامل تھے۔ تین دن میں مأ مختلف سمندروں سے گزرا اور اس کی شہرت بحری دنیا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

انہی دنوں محل میں ایک ایسا درخت پروان چڑھا، جس کے گرد نیلگوں شعاعیں ہلکورے لیتیں، جس کا شفاف شیشے سے بنا تنا اتنا بڑا تھا کہ اسے بازوؤں کے گھیرے میں لینا ممکن نہ تھا، اس کا

درمیان میں سے رنگ سبزی مائل پیلا، شاخیں کسی حسینہ کی نازک بانہوں سی اور پتے زردی مائل سرخ، سکوں سے ذرا موٹے تھے۔ ماٗ اور اس کی دلہن درخت کے نیچے بیٹھ کر خوبصورت نظمیں پڑھتے اور گارڈینیا جیسے مہکتے پھولوں کی برسات میں بھیگتے رہتے۔ درخت کے پتے زمین پر گرتے تو خوبصورت جھنکار سنائی دیتی اور اُٹھا کر ہتھیلی پر رکھو تو ایسے پیارے اور چمک دار ثابت ہوتے گویا منقش سرخ عقیق: اکثر سنہرے اور سبز چمکتے پروں والا ایک حیرت انگیز پرندہ اس درخت پر آ بیٹھتا، اس کی دم اس کے پورے جسم سے لمبی تھی اور اس کی بانسری جیسی سریلی آواز ایسی صاف اور غم میں ڈوبی کہ سننے والی ہر آنکھ نم ہو جاتی۔ اس پرندے کے غم انگیز گیت ماٗ کی روح کو تڑپا دیتے اور وہ تصور ہی تصور میں اپنے آبائی وطن پہنچ جاتا۔

''تین سال ہو گئے مجھے اپنے گھر اور پیارے والدین سے بچھڑے ہوئے'' ایک دن ماٗ نے شہزادی سے کہا ''ان کی یادیں میری آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہیں اور میری پشت پسینے سے بھیگ جاتی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گی؟''

''ایک غیر فانی وجود، فانی وجود کی طرح نہیں رہتا۔'' اس نے جواب دیا ''میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی، لیکن میں میاں بیوی کی محبت کو والدین کی محبت کے راستے میں حائل بھی نہ ہونے دوں گی۔ اس موضوع پر ہم پھر کبھی بات کریں گے۔'' یہ سننا تھا ماٗ آنسوؤں پر ضبط نہ کر سکا اور شہزادی بھی اس کی حالتِ غیر پر آہ کیے بنا نہ رہ سکی۔ ''یہ تو واضح ہے کہ تم بیوی اور والدین دونوں کو ایک ساتھ نہیں پا سکتے۔''

اگلے دن ماٗ سیر کے لیے نکل گیا، واپس آیا تو ڈریگن بادشاہ نے اُسے مخاطب کیا ''ہم نے سنا ہے کہ تم اپنے گھر کے لیے اُداس ہو، کیا تم کل اپنے ملک روانہ ہونا پسند کرو گے؟''

ماٗ خوشی سے کھل اُٹھا، بادشاہ کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا، ''حضور والا آپ کا خادم یہاں ایک اجنبی کی حیثیت سے آیا تھا'' اس نے کہا ''لیکن آپ نے مجھ حقیر کو عزت بخشی، میں آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔ میں اپنے والدین کے پاس مختصر عرصہ قیام کروں گا اور مجھے اُمید ہے کہ میں جلد ہی دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔''

اس شام جب شہزادی الوداعی دعوت کا اہتمام کر رہی تھی، ماٗ نے ایک بار پھر اپنی واپسی کا ذکر چھیڑا۔ ''آہ، نہیں'' اس نے کہا ''ہم دوبارہ کبھی نہیں مل سکتے۔'' ماٗ یہ سنتے ہی صدمے سے نڈھال ہو گیا۔ ''اپنے والدین کے پاس تمہارا واپس جانا تمہاری فرزندانہ سعادت مندی ہے'' شہزادی نے کہا: ''جب قسمت ملانے اور بچھوڑنے کے لا متناہی سلسلے رکھتی ہو اور ایک سو سال ایک دن کی طرح گزر جاتے ہوں تو پھر ہم بچوں کی طرح اپنے آنسوؤں کو راستہ کیوں دیں؟ میں اپنے اور تمہارے رشتے کو سچائی کے ساتھ قائم رکھنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی میرے وفادار رہو گے۔ ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی محبت کرنا خوبصورت عمل ہے، ہم دور سہی، روحانی طور پر ایک رہیں گے: رات اور دن اکٹھے بسر کرنا کچھ ایسا ضروری نہیں، لیکن میرے اور تمہارے درمیان جو بندھن بندھا ہے اگر تم نے اسے توڑا، تو تمہاری دوسری

شادی تمہارے لیے بدبختی لائے گی۔ لیکن اگر تمہیں کسی ہمدم کی ضرورت محسوس ہو تو کوئی لونڈی اس مقصد کے لیے خرید لینا۔ ہاں یاد آیا -- مجھے تم سے ایک بات پوچھنا تھی، تم جانتے ہو کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں چاہوں گی کہ اس کا نام تم منتخب کرو۔''

''لڑکی ہو تو 'ڈریگن محل'' اور اگر لڑکا ہو تو اس کا نام ''بحر مسرور'' رکھنا۔''

''کیا تم جاتے سمے مجھے کوئی نشانی نہ دو گے؟''

اور ماٗ نے شہزادی کے پھیلے ہاتھ پر سرخ عقیق سے بنا سوسن کے پھولوں کا جوڑا رکھ دیا جو اس نے رکشاس کی سرزمین سے حاصل کیا تھا۔

''اب سے تین سال بعد، چوتھے چاند کے آٹھویں دن جنوبی سمندر میں سفر کرنا، میں تمہیں تمہاری امانت، تمہارا بچہ سونپ دوں گی۔'' پھر اس نے مچھلی کے چانوں سے سجا تھیلا دیا جو ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا اور کہا ''اس کی حفاظت کرنا، یہ نسلوں تمہارے خاندان کی کفالت کے لیے کافی ہے۔''

پو پھٹے ڈریگن بادشاہ نے ماٗ کے اعزاز میں الوداعی کھانا دیا اور اُسے بے تحاشا تحائف سے نوازا۔ یہ ماٗ کی ان لوگوں سے آخری ملاقات تھی۔ بوجھل دل سے ماٗ نے سب کو الوداع کہا اور شہزادی کے ہمراہ ایک رتھ میں رخصت ہوا جسے سفید سینگوں والے مینڈھے کھینچ رہے تھے۔ ساحل سمندر پر پہنچ کر ماٗ رتھ سے اُترا، وہیں شہزادی نے ماٗ کو الوداعی بوسہ دیا، تیزی سے پیچھے مُڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کی اُداس لہروں میں کھو گئی۔

گھر والے ماٗ کو اپنے درمیان پا کر حیران رہ گئے کیونکہ اپنے تئیں وہ اسے سمندر کے سپرد کر چکے تھے۔ اس کی بیوی نے دوسری شادی کر لی تھی، بیوی کی دوسری شادی نے اسے سمجھا دیا کہ ڈریگن شہزادی وفا نبھانے پر کیوں مصر تھی یقیناً وہ یہ بات جانتی تھی۔ تین سال کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سمندر کے سفر پر روانہ ہوا۔ سمندر کی لہروں کو چیرتا آگے بڑھ رہا تھا جب اس نے سمندر کے سینے پر موجوں سے کھیلتے، شرارتیں کرتے دو بچے دیکھے۔ وہ ان کے نزدیک ہوا اور محبت سے ان کی جانب جھکا۔ ایک بچے نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جہاز میں سوار ہو کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا، دوسرے نے نظر انداز کیے جانے پر چلا کر غصے کا اظہار کیا، ماٗ نے اسے بھی اُوپر گھسیٹ لیا۔ اس نے دیکھا ایک لڑکا تھا اور دوسری لڑکی، وہ پیارے بچے رنگین ٹوپیاں پہنے تھے جن سے سرخ عقیق سے بنے سوسن کے پھول بندھے تھے۔ لڑکے کی پشت سے تھیلا بندھا تھا جس میں ان کی ماں کا خط تھا:

''میں جانتی ہوں تمہارے والدین بخیر ہیں۔ تین سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ آہ میں جانتی ہوں یہ عرصہ کیسے گزرا۔ سمندر نے ہمیں جدا کر دیا اور بدنصیبی کہ کوئی نیلی چڑیا بھی تو نہ تھی جو ہمارا پیغام لے کر جاتی۔ میرے خواب تمہاری چاہت میں ڈوبے ہیں، میرے اداس دن نرمل آکاش کو تکتے گزرتے ہیں۔ لیکن پھر میں سوچتی ہوں کہ جب چاند کی دیوی کیشیا کے درختوں میں تنہائی کا عذاب سہتی، روگی بن کر

پھرتی ہے، اور جب چرخہ کاتتی نازک دوشیزہ حسرت بھری نظروں سے کہکشاں کو تکتی ہے ___ کہکشاں جس نے اسے محبوب سے جدائی کا شراپ دیا ہے، تو پھر میں اتنی خودغرض کیسے ہوسکتی ہوں کہ تمہارے خوشیوں سے بھرے ساتھ کی تمنا کروں؟ یہ خیال میری آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر مسکراہٹ بکھر دیتا ہے۔ تمہارے جانے کے دو ماہ بعد میں نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا، جو اَب میری گود میں سمٹے، معصوم ہنسی ہنستے، ننھی ننھی باتیں کرتے ہیں اور سارا سارا دن کھجوروں اور ناشپاتیوں کی تلاش میں درختوں کے نیچے بھاگے پھرتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب وہ میرے بغیر رہ سکتے ہیں میں انہیں تمہارے پاس بھیج رہی ہوں، تم انہیں آسانی سے پہچان سکتے ہو۔ ہاں سرخ عقیق سے بنے سوسن کے پھولوں سے ___ جب تم انہیں اپنے گھٹنے پر بٹھاؤ گے تو تم تصور کر سکتے ہو کہ تم تنہا نہیں ہو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے بن کر رہے، یہ احساس میرے لیے باعثِ سکون ہے، میں بھی تا دمِ مرگ تمہاری رہوں گی۔ میں اب اپنے چہرے کو غازے اور پاؤڈر سے نہیں سجاتی اور نہ ہی آئینے کے سامنے اپنی بھوؤں کو گہرا کرتی ہوں۔ تم میرے جہاں گرد اور میں چوکھٹ سے لگی تمہاری منتظر تمہاری پیاری بیوی! اس کے باوجود کہ ہم بچھڑ گئے ہیں، ہم ہمیشہ ایک رہیں گے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ بات غلط ہے کہ بہو سے ملے نہیں اور تمہارے والدین پر پوتے پوتی کا بوجھ ڈال دیا جائے، لیکن یاد رکھنا اگر ایک سال بعد تمہاری ماں اس دنیا سے رخصت ہوئی تو میں اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرنے اس کی آخری رسومات میں ضرور شریک ہوں گی۔ اس کے بعد اگر میری بیٹی ڈریگن محل خوش رہی اور سب سے گھل مل گئی تو ہوسکتا ہے ہماری دوبارہ ملاقات ہو: اور اگر میرے بیٹے بحر مسرور کا دل لگ گیا تو پھر ملاقات کا ایک اور بہانہ مل جائے گا۔ بس تم اپنا خیال رکھنا اور جان لینا کہ لفظ میرے جذبوں کا ساتھ نہیں دے پا رہے۔"

مأ بار بار خط پڑھتا رہا اور لفظ اس کے آنسوؤں سے دھندلے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ دونوں بچوں نے اپنے ننھے ننھے بازو اس کی گردن میں حمائل کیے اور کہا "بابا! کیا ہم اپنے گھر جا سکتے ہیں؟" ننھی معصوم جانوں کا سوال مأ کا دل چیر گیا، وہ تڑپ اُٹھا، انہیں اپنی باہوں میں سمیٹ لیا یہ پوچھتے ہوئے "ہمارا گھر کہاں ہے؟؟؟" بچے بسورے، ماں کے لیے چلائے اور مأ نے سمندر کی وحشی بے کنار وسعتوں میں ہر طرف دیکھا لیکن ماںتا کی تڑپ لیے کوئی شہزادی نمودار ہوئی نہ جھاگ اُڑاتی مست موجوں کے درمیان کوئی سڑک ظاہر ہوئی۔ بچوں کو گھر لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

پھر جب مأ نے جانا کہ اس کی ماں کا وقت قریب آ پہنچا ہے تو اس نے ماتمی جلوس کے لیے ہر تیاری مکمل کر لی اور اپنے آبائی قبرستان میں صنوبر کے ایک سو درخت لگائے۔ اگلے سال مأ کی ماں مرگئی۔ تدفین ہو رہی تھی، اچانک ایک عورت گہرے غم میں ڈوبی قبر کے پاس نمودار ہوئی۔ جیسے ہی سب حیرت سے اس کی طرف متوجہ ہوئے، ویسے ہی ہوا کا ایک بگولہ اُٹھا، بادل گرجا، موسلا دھار بارش برسنے لگی اور عورت ایک دم نظروں سے غائب ہوگئی۔ البتہ ایک حیران کن بات ہوئی، مأ کے لگائے صنوبر کے درخت مرجھائے کھڑے تھے، بارش کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے ہرے ہوگئے۔

مأ کا بیٹا بڑا ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی اپنی ماں کو یاد کر کے روتا تھا، ایک مرتبہ تو عجیب ماجرا ہوا وہ اچانک سمندر میں غائب ہوگیا اور کئی دنوں کے بعد گھر واپس لوٹ آیا۔ اس کی بہن لڑکی ہونے کے ناطے گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ اکثر اپنے گھر میں بند کمرے میں روتی رہتی۔ ایک دن آسمان کا رنگ گہرا سیاہ ہوگیا اور ڈریگن شہزادی اپنی بیٹی کو دلاسا دینے مأ کے گھر میں داخل ہوئی۔ "رومت میری بچی" اس نے بیٹی کو گلے لگا کر کہا "جلد ہی تمہیں تمہارا اپنا گھر مل جائے گا۔"

اس نے بیٹی کو جہیز کے لیے آٹھ فٹ اونچا مونگے اور مرجان کا بنا ایک درخت، قیمتی کافور کا ایک پیکٹ، سو سچے موتی اور قیمتی پتھر جڑے دو سونے کے ڈبے دیئے۔

مأ کو معلوم ہوا کہ ڈریگن شہزادی بیٹی سے ملنے آئی ہے تو وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور شہزادی کا ہاتھ تھام لیا لیکن ایک بار پھر بادل زور سے گرجا اور گرج کے ساتھ ہی شہزادی غائب ہوگئی۔

ان حیرت انگیز واقعات کو ترتیب دینے والا تبصرہ کرتا ہے کہ: "مأ کو اپنے سے اعلیٰ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے اصلی چہرے پر جھوٹا اور گندا چہرہ سجانا پڑا لیکن یہی اس دنیا کا گھناؤنا اور منافقانہ وطیرہ ہے۔ پوری دنیا میں جھوٹے کریہہ المنظر مکروہ لوگ ہی نوازے جاتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر تم کوئی ایسی حرکت کرو جس سے تمہارے اندر کا انسان تھوڑا سا شرمندہ ہو تو تمہیں اس برائی کے بدلے تھوڑا سراہا جاتا ہے اور اگر تم کچھ ایسا کرو، جس پر تمہارا ضمیر تمہیں خوب ملامت کرے تو تم پر شاندار، شاندار کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے اپنے اندر کے سچ کو لوگوں کے سامنے بے نقاب کرے تو لوگ مارے صدمے کے دل تھام کر بیٹھ جاتے ہیں اور اسے برادری سے تین پتھر باہر کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لنگ یینگ کا احمق نیلگوں پتھروں کا بنا اپنا انمول درخت لے کر کہاں جائے؟ کیا وہاں، جہاں جانے کے بعد اسے عمر بھر رونا ہوگا؟؟ (۲)

افسوس صد افسوس! میں غم زدہ ہوں اور کہتا ہوں ___ میں اپنی خوش بختی کو ضرور تلاش کروں گا لیکن کہاں؟ کیا اُڑتے بادلوں میں چھپے محلوں میں یا پھر سمندر کے سینے پر تیرتے ہوئے سرابوں میں؟؟؟

حوالہ جات

۱۔ ژینگ فی (۲۸۰-۲۲۰ق۔م) "تین بادشاہتوں" کے قدیم چینی دور کا ایک مشہور جرنیل تھا جسے چین کے روایتی سٹیج پر کالے چہرے اور لمبی لمبی مونچھوں والے خوفناک آدمی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

۲۔ لنگ یینگ کے رہنے والے ایک شخص نے بہار اور خزاں کے ملے جلے موسم میں ایک ناتراشیدہ جیڈ پتھر کا ٹکڑا چُو کے بادشاہ (۷۲۲-۴۸۱ق۔م) کی نذر کیا۔ بادشاہ اس انمول نذرانے کی قیمت نہ جان سکا اور پتھر کی ناتراشیدگی سے خفا ہو کر اس معصوم شخص کے پاؤں قلم کرا دیئے۔

گلی ترقی/رشید قیصرانی

طلائی دانت

(ایرانی کہانی)

اس سے پہلے کہ ہم پہنچتے ستر نمبر کی بس چل پڑی۔ میری چھوٹی بیٹی اس کے پیچھے چند قدم بھاگتی ہے اور موڑ تک پہنچنے سے پہلے ناامید ہو کر رک جاتی ہے۔ ہم اگلی بس تک کے لیے صبر کر لیتے ہیں۔

اچانک برفباری شروع ہو جاتی ہے اور فضا میں شفاف سا غبار پھیل جاتا ہے۔ شہر کے پر رونق و پر آواز مقامات پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ پیرس میں رہائش کے ان آٹھ سالوں میں یہ پہلی مرتبہ ہے کہ اس قدر شدید برف باری ہو رہی ہے۔

دادی جان کی آواز میرے کانوں میں گونج جاتی ہے

''فرشتے گھر کی صفائی میں مشغول ہیں۔ گرد و غبار کو صاف کر رہے اور آسمان کے قالینوں پر جھاڑو دے رہے ہیں۔''

میں تہران کے روشن اور چمکدار موسم سرما کے بارے میں سوچتی ہوں، صاف شفاف روشن آسمان کے نیچے البرز کے پہاڑ، چھتوں سے برف صاف کرنے والوں کی آوازیں، باغ میں تبریزی درخت دراز قد سفید بوڑھیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔

بچپن کے زمانے میں جب برف گرنا شروع ہوتی تھی تو ایسے لگتا تھا جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ہفتہ، اتوار، سوموار، ہم دن گنا کرتے تھے۔ دس سینٹی، میٹر بیس سنٹی میٹر، آدھا میٹر برف زمین پر جم جایا کرتی تھی اور سکول ایک ہفتے کے لیے بند ہو جایا کرتا تھا۔

کتنی خوش قسمتی ہوتی تھی، کتنی ناقابلِ یقین خوش بختی ہوتی تھی۔ پورا ایک ہفتہ صبح کو دیر تک بستر میں پڑے رہنا، بے شمار خالہ زادوں اور ماموں زادوں کے ساتھ ایک ہفتہ گلیوں میں کھیلنا اور ہفتہ ہیڈ مسٹریس کے خوف کے بغیر حساب کی بدخواستانی سے ملے بغیر فقہ کی کتاب پڑھے بغیر، ذمیہ کام کے بغیر، ایک ہفتہ بے معنی اور لمبے شعر یاد کیے بغیر قلم اور سیاہی سے خوشخطی کی مشق کے بغیر، پڑھائی اور سکول کے چنگل سے رہائی، آزادی اور کھیل کے سات دن۔ کتنا مزہ آتا تھا کہ مہمان آئے ہوئے ہوتے اور برف سے راستے مسدود ہو جاتے۔ پھر وہ دو تین دن ہمارے گھر ٹھہرے رہتے۔ ہمارے ہمیشہ کے مہمانوں میں شامل ہوتے تھے۔ مہربان اور بوڑھی دادی جو صبح شام ہماری درازئ عمر، سلامتی اور خوش بختی کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔

دادی کی بوڑھی بہن بی بی جان جسے سنائی نہیں دیتا تھا اور اس کے حواس کام نہیں کرتے تھے۔ مجھے میرے بجائے، میرا بھائی سمجھتی تھی اور میرے بھائی کو میرا ماموں زاد، میرے ماموں زاد کو ہمسایوں کا

بچہ اور ہمسائے کے بچے کو، مجھے سمجھتی تھی۔

چچی آذر نازنین، جس کے دیوانے بچے برآمدے میں گھوڑی ٹپہ کھیلتے اور وہ جنگلی بندروں سے بھی زیادہ چست تھے، چیختے چلاتے، دروازوں، دیواروں سے درختوں پر چڑھ جاتے یا پھر باڑ کے جنگلوں پر چڑھتے اور اترتے رہتے تھے۔

ماموں احمد جان، جو دنیا کے شفیق ترین ڈینٹسٹ تھے اور ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ کسی کا دانت نکالیں۔ ہم میں سے جب بھی کوئی روتا تو آنسو ان کی آنکھوں سے جاری ہو جاتے۔

بڑے ماموں جو آرٹیلری کے افسر تھے اور گھوڑے سے ڈرتے تھے توپ اور بندوق سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ افسرانہ وردی اتاری اور اس کی جگہ ایپرن باندھ لیا پھر گھر کے ہو کر رہ گئے وہ لذیذ مربہ جات تیار کرتے تھے اور اونی بلوز بنتے تھے۔

اور آخری مہمان موٹی اور سست طوبیٰ خانم جسے عجیب و غریب قصے اور کہانیاں آتے تھے۔ اسے روحوں اور جنوں سے سروکار تھا، جادوگری جانتی تھی اور ہمیں شعبدے دکھاتی تھی۔

یہ سب لوگ برف پگھلنے تک ہمارے پاس رہتے تھے مجھے اس ماحول سے عشق تھا جس میں کمرے مہمانوں سے بھرے ہوتے، قالینوں پر لحاف میزیں مختلف کھانوں سے پر، ساتھ ہی ان پر شربت کی بوتلیں، پیالے انار دانوں سے بھرے ہوئے، فیرنی کے برتن، پستہ، سوھان حلوہ، گز اصفہان اور امی جان کے پکائے ہوئے مزیدار گردہ کلیجی۔

کتنا مزہ ہوتا تھا جب گھر کے ہر کونے سے چکرا دینے والی بوئیں اٹھتیں اور سارے برآمدوں میں پھیل جاتیں، دادی جان کے حقے کے تنباکو کی بو، بی بی جان کے جوشاندوں کی خوشگوار بو، دارچینی اور زیرے، گلاب والے گرم چاولوں پر زعفران کے عطر کی خوشبو، بھونے ہوئے پیاز، سرخ انگاروں پر بھونے گئے کبابوں کی خوشبو مجھے کس قدر پسند تھا کہ ساتھ والے کمرے میں بزرگوں کی چپڑ چپڑ باتوں، ان کے پوشیدہ قہقہوں کی آوازیں سنتے سنتے نیند آ جانا، چھوٹے ماموں کے گٹار بجانے کی مدھم آواز، چچی آذر کی میٹھی گنگناہٹ، امی جان کے سیڑھیوں پر چڑھنے اور اترنے سے ان کی چپلوں سے اٹھنے والی ٹک ٹک کی آوازیں سننا اور پھر نیند کا آ جانا۔ رات کو پھر بیدار ہو جانا اور دیکھنا کہ بزرگ ابھی جاگ رہے ہیں۔ بتیاں جل رہی ہیں۔ کچن میں آمد و رفت جاری ہے۔ ڈونگوں کے رکھنے کی آوازیں آ رہی ہیں اور پھر دوبارہ نیند کا آ جانا اور یہ نیند شریر پتنگ کی پرواز سے بھی ہلکی پھلکی ہوتی۔

میں آج رات بھی، بچپن کے دور کی طرح، برف کے تماشوں سے خوش ہوتی ہوں اور خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ میری بیٹی بھی اسی طرح خوشی سے مسحور ہے، وہ اپنے گرد چکر لگا رہی، رقص کر رہی ہے۔ اپنی ننھی منی مٹھیوں میں برف کے گولے بناتی ہے اور مختلف سمتوں میں پھینکتی ہے، سڑک کے درمیان میں دوڑ رہی ہے اور بے قراری سے ستر نمبر کی منتظر ہے۔ اس کی بیتابی مجھے اپنے دل کی ماضی کی دھڑکنوں

کی یاد دلاتی ہے۔ جن دنوں مغرب کے بعد سکول سے واپسی کے وقت، میں سڑک پر نگاہیں گاڑے اپنے دوست عزیز آغا کو دیکھنے کے لیے منٹ منٹ گنا کرتی تھی۔ میں اپنا چہرہ اوپر کی طرف کرتی ہوں، منہ کھولتی ہوں تا کہ میری زبان پر برف کے ذرات آ پڑیں۔ یہ برف کتنا مزہ دیتی ہے اور اس کی بو کس قدر خوش گوار ہے ایسے لگتا ہے جیسے گل یاسمین کے ہزاروں پتے آسمان کے باغیچوں سے زمین پر برس رہے ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے قدم زمین سے اٹھ گئے ہیں اور میں فضا میں تیر رہی ہوں ایسے لگتا ہے جیسے میں شیشے کے بلبلے میں ہوں اور ایک پوشیدہ پھونک مجھے گزرے ہوئے زمانے میں لے جاتی ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ میں دس سال کی ہوں۔ مدرسہ کے قریبی چوک پر شمیران والی بس کی منتظر ہوں۔ ہمارا نیا گھر دنیا کے اس سرے پر ہے۔ ٹیلوں سے پرے اور خالی زمین کے درمیان ہم رہتے ہیں۔ ہمارے گھر کے اردگرد کوئی گھر نہیں ہے۔ بعض راتوں کو گیدڑوں کی آوازیں آتی ہیں اور امی کو ڈر لگتا ہے۔ باورچی حسن بھی ڈرتا ہے اور ابا جان کے کمرے کی پشت پر واقع گیلری میں اپنا بستر بچھاتا ہے۔ ویرانہ کے درمیان واقع گھر مجھے پسند ہے۔ پانی کے بڑے ٹینک اور مینڈکوں سے بھرے تالاب، درختوں کے تاریک سایے جو بد اطوار لوگوں کی شبیہیں لگتے ہیں۔ ان سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔ باغ کے درمیان، شمشاد کے درختوں کے پیچھے، میں نے اپنے لیے پرانی چادروں سے، ایک چھوٹا سا کمرہ بنا رکھا ہے۔ مجھے کوئی وہاں ڈھونڈ نہیں سکتا۔ میں کھانے پینے کی چیزیں اینٹوں کے نیچے چھپا کر رکھتی ہوں، ماں کے ڈر سے اپنے وہ ٹیسٹ جن میں مجھے صفر ملا ہے، مٹی کھود کر اس میں دبا دیتی ہوں۔ تبریزی درخت میرے ساتھی کھلاڑی ہیں۔ ہر ایک کا اپنا نام ہے۔ جو درخت اونچے ہیں وہ لڑکے ہیں۔ جب میں سکول سے آتی ہوں تو بستہ پھینک کر دوڑتی ہوئی وہاں ان کے پاس چلی جاتی ہوں۔ جو کام میں نے کیے ہیں وہ ان کے سامنے بیان کرتی ہوں۔ اپنی مصوری انہیں دکھاتی ہوں اور اپنی فارسی کی کتاب میں سے اونچی آواز میں پڑھ پڑھ کر انہیں سناتی ہوں۔ بعض خراٹے لے رہے ہوتے ہیں اور بعض جمائیاں، کچھ ان میں حاسد اور بدفطرت ہیں اور وہ میری باتیں نہیں سنتے۔ جو میرے دوست ہیں میں انہیں چومتی ہوں اور ان کے پتوں پر چبائی ہوں چیونگ گم چپکاتی ہوں جو پیٹھ پیچھے میری برائی کرتے ہیں۔ ان کی پٹائی کرتی ہوں اور ان کی ٹہنیوں کو رسی سے باندھ دیتی ہوں۔

اگر میں والد کی کار سے ''مدرسہ فیروز کوہی'' جاؤں تو آدھا گھنٹہ لگتا ہے اگر ہم بس سے جائیں تو راستے میں ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ بھائی مجھ سے بڑا ہے اور وہ اکیلا آتا جاتا ہے۔ لیکن مجھے ''حسن آقا'' کا ہاتھ تھامنا چاہیے اور اس کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھانا چاہیے۔ یہ میری ماں کا حکم ہے لیکن میں ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کرتی ہوں۔ اگر حسن آقا نے ماں سے ایک لفظ بھی میرے خلاف کہا تو میں اس کی کھال کھینچ سکتی ہوں کیونکہ مجھے علم ہے کہ سٹور کی جو چابی گم ہوگئی ہے وہ ''حسن آقا'' کے کوٹ کے استر میں ہے اور مجھے پتہ ہے جس وقت امی گھر پر نہیں ہوتی تو وہ مٹھی بھر دالیں چاول، لوبیا سٹور میں سے چراتا ہے اور باغ کے وسط میں واقع لیٹرین کے پیچھے جا چھپاتا ہے جس دن چھٹی پر جاتا ہے تو یہ سب چیزیں ساتھ لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی غرض نہیں ہے اور ہم دونوں مساوی طور پر طاقتور ہیں۔

جب چار بجے چھٹی ہوتی ہے تو حسن آقا مجھے لینے آجاتا ہے اور ہم شمیران والی بس کا انتظار کرتے ہیں۔ آج برف باری شروع ہے، خاصی برف پڑ چکی ہے۔ ہر جگہ سفید ہوگئی ہے، حسن آقا دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہے اور ایک بھوت نظر آتا ہے۔ اس کا چہرہ بادل کی طرح صاف شفاف لگتا ہے، ان بادلوں کی طرح جو میں راتوں کو آسمان پر دیکھتی ہوں اور مجھے علم ہے کہ یہ بادل ہزاروں سال پہلے والے انسان ہیں۔ بعض کی لمبیاں داڑھیاں ہیں اور ان کے سروں پر تاج ہیں۔ یہ گھوڑوں پر سوار ہیں اور تیزی سے گزر رہے ہیں۔ اگر انسان اچھی طرح دیکھے تو چاند میں ایک چھوٹا سا بچہ پالتی مارے بیٹھا ہے۔ اس نے ٹانگوں پر سر رکھا ہوا ہے اور رو رہا ہے، میں جس قدر بھی یہ بچہ اپنے احمق بھائی کو دکھانے کی کوشش کرتی ہوں اسے نظر نہیں آتا۔ ماں چودھویں کے چاند سے ڈرتی ہے اور مجھے کہتی ہے میں ستاروں کو گھور گھور کر نہ دیکھا کروں۔ کبھی کبھار آسمان کے اندر سے ایک بڑا اژدھا نکلتا ہے اور کہکشاں کے ساتھ ساتھ نیچے چلا جاتا ہے۔ جب میں یہ بات حسن آقا کو بتاتی ہوں تو وہ چیخ مارتا ہے لحاف اوڑھ لیتا ہے اور اونچی آواز میں دعائیں پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔

شمیران والی بس کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ میں خوش ہوں اور سڑک کے درمیان پھسلن بازی کر رہی ہوں۔ درختوں کے تنوں کو لاتیں مارتی ہوں تا کہ برف میری کھوپڑی پر گرے۔ حسن آقا نے میرا بستہ اور ٹفن بغل میں لیا ہوا ہے اور کانپ رہا ہے۔ اسکے منہ سے بے جان بھاپ نکل رہی ہے۔ اس نے میرے ابو کے پرانے جوتے پہنے ہوئے ہیں جو اس کے پاؤں سے کچھ بڑے ہیں۔ اس کی ایڑی سے پیچھے کچھ جگہ خالی ہے اور ٹھیک اسی سوراخ میں برف پڑ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ بھی چھوٹے ہیں اس نے میری ماں کے دستانے اپنے ہاتھوں میں پہنے ہوئے ہیں۔ یہ دستانے بے جوڑ ہیں ایک چمڑے کا ہے جس کا رنگ سرخ ہے جبکہ دوسرا جالی دار ہے جس کا رنگت سیاہ ہے۔ ابو کا حکم ہے کہ ہر عید پر سب کے لیے نئے کپڑے، کوٹ، جوتے، جرابیں اور (UnderGarments) زیر جامہ خریدے جائیں۔ حسن آقا اپنا نیا لباس نہیں پہنتا بلکہ وہ اسے اپنے ٹرنک میں رکھتا ہے۔ سردیوں کے آخر میں جب وہ گاؤں جاتا ہے تو ساتھ لے جاتا ہے یا پھر انہیں بیچ دیتا ہے جو رقم ملتی ہے وہ اسے کمرے کی انگیٹھی کے پائپ میں چھپا دیتا ہے۔ صرف میں ہی ہوں جسے پتہ ہے کہ اس کی رقم کہاں ہے لیکن میں اس رقم کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی اس بات کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔

بس کے انجن کی آواز دور سے آرہی ہے۔ حسن آقا اپنی جگہ سے اچھل پڑتا ہے۔ میں پریشاں اور خوشی سے بس کے سفید کیبن کو دیکھتی ہوں جو چمکتا دمکتا ہوا نزدیک آتا جا رہا ہے۔ میں اپنے آپ سے کہتی ہوں ''اگر اس نے اپنی سامنے والی بتیاں روشن کیں اور بجھائیں تو سوار ہو جاؤں گی ورنہ بعد میں آنے والی بس کے لیے صبر کروں گی۔ خواہ حسن آقا سردی سے منجمد ہو جائے، ماں پریشانی سے دیوانی ہو جائے یا پھر میں خود بھوک اور تھکاوٹ سے مر جاؤں۔'' یہ راز ہے جسے کوئی بھی نہیں جانتا یہ میرے اور

عزیز آقا کے درمیان راز ہے۔ حتیٰ کہ حسن آقا بھی اس سے بے خبر ہے اور اسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ میں بعض دنوں شمیران والی بس میں سوار کیوں نہیں ہوتی (وہ بس جو بتیاں جلاتی بجھاتی نہیں ہے وہ عزیز آقا کی بس نہیں ہے) اور کیوں بھاگ جاتی ہوں۔ اس کی چیخ و پکار اور اعتراض وغیرہ کی پروا نہیں کرتی۔ کئی مرتبہ اس نے دھمکی دی ہے کہ میری ماں کو بتائے گا اور میں نے اس کے کوٹ کے استر میں موجود سٹور کی چابی کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ یہی وجہ سے کہ اب اسے مجھ سے سروکار نہیں ہے اور مجھے اس معاملہ میں آزاد کیا ہوا ہے۔ وہ بس جو دور سے دو تین مرتبہ بتیاں جلاتی بجھاتی ہے وہ عزیز آقا کی ہے۔ میں ہر رات سونے سے پہلے اس دعا کے بجائے، جو ماں نے مجھے سکھائی ہے، تین بار یہ کہتی ہوں کہ ''میں سوائے عزیز آقا کی بس کے اور کسی بس میں سوار نہیں ہوں گی۔'' یہ عہد جو ہم نے آپس میں کر رکھا ہے، قیامت کے دن تک کے لیے ہے، البتہ ایسا وعدہ جو بغیر کہے ہو چونکہ میرا دوست بھاری بھرکم ہے اور اس کا قد میرے باپ کے قد سے بھی لمبا ہے اور سپاہی بھی اس کے خوفناک چہرے سے ڈرتے ہیں، میں اس سے بات نہیں کرتی بلکہ بات کرنے کی جرات نہیں ہوتی۔

دور سے آتی ہوئی بس کی بتیاں جب بجھتی اور روشن ہوتی ہیں تو میرا دل خوشی سے لٹو کی طرح اپنے گرد گھومنا شروع کر دیتا ہے، وہ بس روکتا ہے تا کہ میں سوار ہو جاؤں۔ حسن آقا مجھ سے آگے جاتا ہے۔ عزیز آقا مجھے دیکھتا ہے اور اپنی سوجی ہوئی آنکھوں سے میرے سلام کا جواب دیتا ہے۔ اس کے بال گھنگھریالے اور چکنے ہیں حسن آقا کہتا ہے کہ اس نے چھ ماہ کے لیے بال گھنگھریالے کرائے ہیں، اس کے ابرو سیاہ ہیں، گھنی مونچھوں نے تمام منہ کو چھپا رکھا ہے۔ میں اس کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھتی ہوں۔ حسن آقا بس کے درمیان جا بیٹھتا ہے کیونکہ وہ جگہ زیادہ گرم ہے اور بیٹھتے ہی سو جاتا ہے۔ بس کے مسافر گنتی کے چند افراد ہیں اور سب اونگھ رہے ہوتے ہیں۔ سکول سے گھر تک ایک سفر ہے خاص طور پر سردیوں کے دنوں میں جب برفباری ہو جائے اور چین Chain کے بغیر چلنے والی کاروں کے پھسلنے کی وجہ سے سڑک بند ہو جائے۔ بعض دنوں میں عزیز آقا تھکا ماندہ ہوتا ہے اور وہ جمائیاں لے رہا ہوتا ہے اس کے منہ کی بو اس ٹنکچر سے بھی تیز ہوتی جو میری ماں میری ران کے زخم پر لگاتی ہے۔ مجھے چکر آنے لگتے ہیں میرا جی متلانے لگتا ہے۔ وہ شیشہ میں مجھے دیکھتا ہے اور شکلیں بناتا ہے۔ منہ میں ہوا بند کر کے گالوں کو پھلاتا ہے، اپنی ناک ہلاتا ہے اور آنکھوں سے گھورتا ہے۔ میں منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہوں تا کہ دوسرے مسافر میرے ہنسنے کی آواز نہ سنیں۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ میرے دوست کی شکل دیو جیسی ہے اور بچے اس سے ڈرتے ہیں۔ اس کے ہاتھ اور سینہ گودے ہوئے ہیں۔ اس کے کان سے اس کی گردن تک ایک سرخ موٹی لائن کھنچی ہوئی ہے جیسے کسی نے اس کی گردن کاٹنی چاہی ہو۔ ماں کبھی بس پر سوار نہیں ہوتی، اس کی اپنی کار اور اپنا ڈرائیور ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ عزیز آقا جیسے دیو دنیا میں موجود ہیں اس لیے وہ میرے بارے میں بہت فکرمند رہتی ہے۔ اسے یہ پسند نہیں کہ میں بس سے سکول جاؤں لیکن

یہ ابو کا حکم ہے جس سے روگردانی ممکن نہیں۔

حسن آقا سیٹ پر پالتی مارے سو رہا ہے۔ ٹوٹے ہوئے شیشے سے سردی بس کے اندر آ رہی ہے اور مسافر اس سے ٹھٹھر رہے ہیں۔ عزیز آقا اپنا کوٹ اتارتا ہے اور میری ٹانگوں پر پھیلا دیتا ہے۔ کوٹ سے بدبو آ رہی ہے۔ مجھے یہ پسند ہے کہ مسافر مجھے دیکھیں میں غرور سے کوٹ کے چکنے کالروں پر ہاتھ پھیر رہی ہوں۔ میری انگلیوں کی بو عجیب ہو گئی ہے، ایسی بو جو ہمارے گھر میں نہیں ہے بلکہ ماموں، چچی وغیرہ کے گھر میں بھی نہیں۔ نہ کتے، بلی، گائے اور دنبے کی بو بھی نہیں ہے۔ یہ ایسی بو ہے جو نہ پہچانی گئی دنیا کے سوراخوں سے آ رہی ہے ایسے تمام برے کاموں کی بو جو نہیں کیے جانے چاہئیں اور فی الحال انہیں جاننا بھی نہیں چاہیے۔

ماں کی بو باقی تمام کی بو سے جدا ہے۔ یہ وہ بو ہے جو عطر اور یورپی پاؤڈر کی بو ہے۔ یہ بو سینما کے فنکاروں سے، فیشن کے رسالوں سے، خیابانِ لالہ زار سے اور کیفے کے ڈانس روم سے آتی ہے۔ ماں مستقبل کی بو دیتی ہے۔ آنے والے کل کی خوشبو اور تمام اچھی چیزوں کی خوشبو جو میری منتظر ہیں۔

جب یہ کوٹ میرے زانوؤں پر ہوتا ہے تو میں ایک اور انسان بن جاتی ہوں۔ ایسا انسان جو صاف ستھرا رہنے با ادب، پڑھاکو بننے، پہلی پوزیشن لینے، بالوں کو باندھ کر چوٹی بنانے، سب کو سلام اور تعظیم کرنے، تمام دعوتوں میں سکول میں یاد کیے گئے عجیب شعر جن کے مطلب سے وہ آشنا نہیں سنانے، پیانو کا پہلا سبق جو صرف ''دو، رہ، می، فا، سل، لا، سی'' کی تکرار پر مشتمل ہے۔ اپنے باتونی، بے حوصلہ رشتہ داروں کے سامنے بجانے، بچوں کے مقابلہ حسن میں شرکت کر کے اول آنے پر مجبور نہیں ہے۔

ٹانگوں پر آقا عزیز کے کوٹ سے میں آقا عزیز کی طرح ہو جاتی ہوں۔ اس کی شبیہ بن جاتی ہوں۔ میں گمان کرتی ہوں کہ میرا تمام بدن گودا ہوا ہے اور میرے آدھے دانت سونے کے ہیں۔ میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں کہ تنہا گلی کوچوں میں پھر رہی ہوں اور فاطمہ دھوبن کی بیٹیوں کی طرح ٹھٹھا مار کر ہنس رہی ہوں۔ محلّہ کی خوبصورت ترین گاڑی میں آقا عزیز کے ساتھ بیٹھ کر ٹارزن فلم دیکھنے جا رہی ہوں۔

جب ہم آبشار سٹاپ پر پہنچتے ہیں تو آقا عزیز بس روکتا ہے اکثر مسافر اتر جاتے ہیں تا کہ سڑک کے کنارے قہوہ خانہ سے چائے پئیں۔ میں اور حسن آقا اپنی جگہ سے نہیں اٹھتے۔ وہ شیشے میں دیکھتا ہے اور پلکیں جھپکاتا ہے۔ اس کا چہرہ سراپا مہربانی ہے وہ ایک روبوٹ لگتا ہے۔ میرا دوست دنیا کا سب سے اچھا دیو ہے، اس کے ہاتھ پاؤں سے، اس کے منہ کی عجیب بو سے، اس کی سرخ آنکھوں سے اس کے پرانے اور چکنے کوٹ سے کوئی چیز، شفاف بخارات کی طرح نکلتی ہے اور مجھے گھیر لیتی ہے۔ میں اس طلسمی بخاراتی بگولہ میں برف کے ٹکڑے کی طرح پگھل جاتی ہوں مجھے خوش بختی کا ایسا احساس ہوتا ہے کہ میرا دل چاہتا ہے میں اس جگہ ایک سنگی مجسمہ بن جاؤں اور ہزاروں سال یہیں رہوں۔ اسی طرح رہوں بغیر تبدیل ہوئے بغیر بڑی ہوئے۔

آج عزیز آقا نے میرے لیے خشک آلبالو خریدے ہیں۔ حسن آقا بس کے درمیانی حصے میں

سے مجھے پکارتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اب کیا کریں؟ میں اسے جواب نہیں دیتی اور جلد جلد آلبالو گنتی ہوں۔ مسافر کھڑے چائے پی رہے ہیں۔ عزیز آقا بوتل میں سے چند گھونٹ پیتا ہے بعد میں درختوں کے پیچھے پیشاب کرنے چلا جاتا ہے۔ میں نہیں دیکھتی۔ میں سر جھکا لیتی ہوں اور جلدی جلدی آلبالو گنتی ہوں۔ میں تصور میں اسے دیکھتی ہوں اور میرے کان گرم ہو جاتے ہیں۔

ہم چل پڑتے ہیں اور ''میدان ونک'' تک چیونٹی کی رفتار سے چلتے ہیں۔ کبھی کبھار دوسری گاڑیاں پھسل جاتی ہیں اور سڑک کے عین درمیان ہمارے سامنے رک جاتی ہیں۔ فضا تاریک ہے لیکن تمام زمین برف سے سفید ہے۔ حسن آقا ڈرتا ہے اور بس کے وسط سے مجھے پکارتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ چند لمحے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں گے۔ رونا تو اس کی جیب میں ہے۔ دن میں بغیر کسی وجہ کے تین چار مرتبہ آنسو بہاتا ہے۔ ماں کو یقین ہے کہ حسن آقا کے دکھ مرغی کی کڑ کڑ کی طرح ہیں اور ان غموں کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ حسن آقا نرا گدھا ہے۔ حسن آقا یہ سن کر ہنستا ہے اور اسے گدھا ہونا پسند ہے۔ وہ خوشی خوشی کھانے کے برتن جمع کرتا ہے اور اس کی نگاہیں، ابا جان کے منہ پر لگی ہیں جو اطمینان سے کباب کھا رہے ہیں اور پھر وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ ابا جان اس کے پکوان سے خوش ہے۔

میرے قریب کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور اس میں سے ٹھنڈی ہوا، میرے چہرے پر ایک طرف لگ رہی ہے۔ میری گردن خشک ہو گئی ہے اور میری پیٹھ سردی سے اکڑ گئی ہے۔ بس کے شیشہ میں سے میری طرف دیکھتے ہوئے عزیز آقا پریشان ہے، وہ بس روکتا ہے اور اخبار کا صفحہ اور ایک پرانا کپڑا کھڑکی میں ٹھونستا ہے اور پھر دوبارہ سٹیرنگ پر جا بیٹھتا ہے۔ میں اس کی خاموش زبان سمجھتی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ اسے دلی تکلیف ہو رہی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اپنی سیٹ بدل لوں۔ جیسے وہ مجھے اپنی آنکھوں سے کہہ رہا ہو ''اٹھو چھوٹی ضدی لڑکی تمہیں سردی لگ رہی ہے۔ بس کے درمیان میں چلی جاؤ۔ وہ جگہ گرم ہے۔ مجھے ڈر ہے تم بیمار ہو جاؤ گی۔'' میں بھی اسے نگاہوں میں جواب دیتی ہوں ''نہیں! میں اس جگہ سے نہیں ہلوں گی۔ یہ میری مخصوص سیٹ ہے میں اسے نہیں چھوڑتی۔''

مجھے عزیز آقا کی پریشانی بھلی لگتی ہے۔ یہ ماں کی طرح اس کی شفقت اور گہری دوستی کو ظاہر کرتی ہے۔ میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور بادشاہوں کے دور کے سفر پر روانہ ہو جاتی ہوں۔ اس زمانے کے سفر پر جب وفادار پہلوان اپنے خلوص اور جان نثاری کے ثبوت کے لیے دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگے پاؤں چلتے تھے اور سات سروں والے اژدہوں سے لڑتے تھے۔

بس اب رکی ہوئی ہے۔ راستہ بند ہے۔ سردی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ میرے جسم کا دایاں حصہ اکڑ گیا ہے۔ پنجوں کی نوکوں سے ٹیسیں نکل رہی ہیں اور میری ٹانگیں سن ہو گئی ہیں۔ سر پہاڑ کی طرح بھاری ہو گیا ہے جیسے سوج گیا ہو۔ یہ بڑا اور چھوٹا ہو رہا ہے۔ میں ٹھٹھر گئی ہوں اور میری نیم باز پلکوں سے برف پر سایے چکراتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ ناک سے پانی بہنے لگا ہے، آنکھیں جل

رہی ہیں۔ میں یکدم بھڑک اٹھی ہوں میرا بدن گرم ہو جاتا ہے۔ میں کانپنے لگتی ہوں، سردی سے میرے دانت بجنے لگتے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسو تیزی سے گرنے لگتے ہیں۔ عزیز آقا اپنی درشت انگلیوں سے میرے گالوں کو پونچھتا ہے اور منہ بند کیے مسکراتا ہے۔ جو طالب علم اسے جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کے سارے دانت سونے کے ہیں۔ میں یقین نہیں کرتی اور ماں سے پوچھتی ہوں وہ بھی نہیں جانتی اور عزیز آقا کو نہیں جانتی۔ لیکن میرے اس سوال کو اس نے پسند نہیں کیا اور غصے سے مجھے دھمکی دیتی ہے کہ اگر میں نے دوبارہ بسوں کے ڈرائیوروں کو دیکھا یا ان سے بات کی تو وہ میری کھال کھینچ لے گی۔ میری ماں کی نظروں میں صرف برے اور بدمعاش لوگوں کے دانت سنہری ہوتے ہیں اور یہ سب چور اور قاتل ہیں اور چھوٹی لڑکیوں کے لیے ہزاروں مصائب کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا اور جس وقت میں دیکھتی ہوں کہ ماں پست فطرت اور دروغ گو بن جاتی ہے تو میرا دل کڑھتا ہے اور کبھی کہتی ہے کہ پھوپھی آذر موٹی اور بدصورت ہے۔ مجھے اس بات سے بھی دکھ ہوتا ہے کہ ماں بہت سی باتیں نہیں جانتی۔ مثلاً اسے اکثر ملکوں کے پایہ تخت کا علم نہیں ہے، حساب کے سادہ سے قوانین سے بھی ناآشنا ہے ان سب کے باوجود وہ دنیا میں سب سے اچھی اور خوبصورت ترین ماں ہے۔ جب راتوں کو اکثر سونے سے پہلے وہ میرے بیڈ پر آ کر بیٹھتی ہے اور دل لگی کی باتیں کرتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان برے خیالات کا اس کے سامنے اعتراف کروں جو میرے دل میں اس کے خلاف ہیں۔ لیکن ماں ہمیشہ کاموں کے پیچھے لگی ہوتی ہے اسے جلدی ہوتی ہے اور وہ میری باتیں نہیں سنتی اور اگر اسے پتہ چل جائے کہ میں نے دروازے کے پیچھے سے اس کی اور ابا جان کی باتیں چپکے سے سنی ہیں تو وہ مجھے سخت تنبیہہ کرے گی۔

عزیز آقا برف اور راہ بند ہونے سے الجھ جاتا ہے اور بس کو چند قدم آگے لے جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتا ایسے لگتا ہے جیسے سفید بیابان میں ہم راستہ کھو گئے ہیں۔ دور سے حسن آقا کی آواز مجھے سنائی دیتی ہے وہ رو رہا ہے اور خوف سے سسکیاں بھر رہا ہے۔ میری حالت عجیب ہے مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں بیمار ہو گئی ہوں۔ آلبالو سے مرا پیٹ پھول گیا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں قے کر دوں۔ میں نے عزیز آقا کا کوٹ اپنے ہاتھوں پر پھیلا رکھا ہے اور میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کھڑی ہو جاؤں لیکن میری ٹانگوں میں طاقت ہی نہیں۔ میں منہ کھولتی ہوں لیکن آواز نہیں نکلتی۔ ہر جگہ برف سے پر ہے ساری بسیں، سارا شہر، ساری دنیا۔ میں اس سفید کیبن میں ٹھٹھر گئی ہوں۔ سالوں سے میں اس منجمد میں ہوں۔ صرف آنکھیں ہیں جو دو بھٹیوں کی طرح جل رہی ہیں۔ آنسو تیزی سے بہتے ہیں، میرا منہ خشک ہو گیا اور پانی کی شدید خواہش ہے۔ پانی، پانی، پانی۔۔۔۔۔

ایک ٹھنڈا اور معطر ہاتھ جس سے کریم اور پوڈر کی خوشبو آ رہی ہے۔ میرے ماتھے کو سہلاتا ہے کوئی میرے کانوں میں دعائیں پڑھ رہا ہے اور میرے چہرے پر پھونکیں مار رہا ہے۔ میرے بیڈ کے گرد آشنا چہرے کھڑے ہیں بڑی اور پیاری آنکھوں والی پھوپھی آذر بلب کی روشنی میں چمک رہی ہے۔ بی

بی جان کے جوشاندے کی خوشبو آ رہی ہے۔ میں اپنے کمبل کی نرمی اور صاف ستھری چادروں کو پہچان لیتی ہوں اور جان جاتی ہوں کہ میں اپنے بیڈ پر ہوں اور ماں میرے پہلو میں ہے۔

سکون کے احساس سے میرا دل لبریز ہے۔ مجھے نیند آ جاتی ہے اور خواب میں دیکھتی ہوں کہ میں عزیز آقا کی پیٹھ پر سوار ہوں اور وہ ایک اڑنے والے قالین پر بادلوں سے بھی اونچا اڑ رہا ہے۔ وہ مجھے دور دراز اور نامعلوم شہروں کی سیر کرا رہا ہے۔ میری کتنی شدید دلی خواہش ہے کہ وہ اپنا منہ کھولے اور میں اس کے سنہری دانت دیکھوں لیکن افسوس اس نے اپنے منہ کو ایک موتیوں بھرے صندوق کی طرح بند کر رکھا ہے۔

میں سخت بیمار ہوں اور ڈاکٹر کوثری ہر ہفتے، جمعرات کے دن معائنے کے لیے آتا ہے۔ میرے سینے سے خرخر کی آوازیں آتی ہیں اور راتوں کو میرا بخار تیز ہو جاتا ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے۔ دوائیں تبدیل کر دیتا ہے اور میری حالت پہلے سے بھی خراب ہو جاتی ہے۔ میں کمزور زرد اور پژمردہ ہو گئی ہوں۔ میرے سر کے بال گر رہے ہیں۔ میرے لیے ایک اور ڈاکٹر لے آتے ہیں جسے خود مجھ سے بھی زیادہ کھانسی ہے اور اس کی تجویز کردہ دوائیں کسی بھی میڈیکل سٹور سے دستیاب نہیں ہیں۔

دن اور ہفتے ہوا کی مانند گزر رہے ہیں۔ سکول اور سبق مجھے بھول گئے ہیں۔ میں دنوں کو سوتی ہوں اور نیند میں بھی کھانستی ہوں۔ دادی جان میرے بستر کے پاس بیٹھتی ہیں اور زیرلب وِرد وظیفے پڑھتی ہیں۔ اگر میں جاگ جاؤں تو مجھے کہانیاں سناتی ہیں اور چمچہ چمچہ غذا میرے حلق میں انڈیلتی ہیں۔ میں ہر روز چار بجے بعد از ظہر شمیران جانے والی بس کو دیکھتی ہوں جو سکول کے سامنے والے چوک سے گزرتی ہے اور عزیز آقا غمگین اور تنہا، میری خالی سیٹ کو دیکھتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ شاید اس نے مجھے بھلا دیا ہے اور ڈیش بورڈ میں رکھی کھانے پینے کی چیزیں کسی اور لڑکی کو دیتا ہے۔ میرا دل حسد سے جلتا ہے اور میری کھانسی تیز ہو جاتی ہے۔ ماں سراسیمہ ہو کر ڈاکٹر کوثری کو اطلاع دیتی ہے۔ میں اپنے باپ کی آواز سنتی ہوں کہ وہ حکم دیتا ہے کہ مجھے یورپ بھیجنے کے لیے تیار کیا جائے۔

میں اس سال فیل ہو جاؤں گی۔ میں روتی ہوں اور پھوپھی آذر کہتی ہے کہ صحت سے اہم کوئی چیز نہیں۔ کاش کہ گرمیاں جلد آ جاتیں اور چیری کا پھل پک جاتا۔ گرمیوں میں ہمارا گھر زیادہ پُررونق ہو جاتا ہے۔ ہمارا خاندان ایک بڑا قبیلہ ہے جس میں بیسیوں خالائیں، پھوپھیاں، ماموں اور درجن بھر خالہ زاد اور ماموں زاد ہیں۔ والد صاحب اس قبیلے کے سردار ہیں اور سب ان کا لحاظ کرتے ہیں۔ جمعہ کے دن یہ قبیلہ ہمارے گھر دوپہر کا کھانا کھاتا ہے اور ماں آدھے سے زیادہ مہمانوں کو رات کو روک لیتی ہے۔ یہ سب اکٹھے باغ میں چھت پر سوتے ہیں۔ بچے ایک قطار میں، ان سے بڑے تبریزی درختوں کے پاس چارپائیوں پر مچھردانیوں کے نیچے۔ ابا، باغ میں بنائے گئے کیبن میں سوتے ہیں جس کے دونوں طرف پانی کی نالیاں رواں ہیں اور صبح تک پانی کی شرشر سنائی دیتی رہتی ہے۔ دادی اماں ہم بچوں کے ساتھ سوتی ہے اور ہماری نگران ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کے سرہانے برف سے بھرا ایک گلاس اور یاسمین کے پھول

رکھتی ہے۔ بچوں کو گنتی ہے اور ہر ایک کا نام پکارتی ہے تاکہ مطمئن ہو جائے کہ ہر کوئی اپنی جگہ پر ہے۔ رات کی آوازیں مجھے پسند ہیں۔ دُور سے آنے والی مینڈکوں کی آوازیں، گرد و پیش سے جھینگر کی، ضدی اور کمینے مچھروں کی آوازیں جو آ کر کانوں میں ساز بجاتے ہیں۔ سونے سے پہلے میں آسمان پر ستارے گنتی ہوں۔ بادلوں کو دیکھتی ہوں جن کی شکلیں آدمیوں جیسی ہیں۔ ان میں سے ایک کی شبیہہ عزیز آقا کی ہے۔ وہ اتنی بلندی سے مجھے آوازیں دیتا ہے اور شکلیں بناتا ہے۔ ماموں کے لڑکے چپڑ چپڑ باتیں کر رہے ہیں اور دادی جان وہ لمبی شاخ جو انہوں نے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے، ان کے پاؤں پر مارتی ہے۔ چھوٹا ماموں خراٹے لیتا ہے جس سے باہر کتے بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔ بی بی جان نیند میں باتیں کرتی ہے طوبیٰ خانم صبح تک خارش کی وجہ سے اپنا جسم کھجلاتی رہتی ہے۔ بچوں میں سے کوئی مسلسل بدبو خارج کر رہا ہوتا ہے دادی جان غصے سے اچھل پڑتی ہے اور چاہتی ہے کہ معلوم کرے کہ یہ کس کی کارستانی ہے لیکن سب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ سو چکے ہیں اور کوئی سانس تک بھی نہیں لیتا۔

ستاروں کی روشنی اور بھینی بھینی خوشبو کے ہمراہ نیند آنکھوں کو پُر کر دیتی تھی۔ بعض راتوں کو بارش شروع ہو جاتی تو دادی اماں موٹی نائلون کی چادر، جو وہ پہلے سے اپنے پاس رکھے ہوتی ہیں، ہم پر پھیلا دیتی، میں اور ماموں کے بیٹے اس موٹی چادر کے نیچے ایک دوسرے سے جڑے، جیسے زمین کے نیچے چیونٹیاں ہوتی ہیں اپنے سروں پر بارش کی ٹپ ٹپ سنا کرتے تھے۔

جب سے میں بیمار ہوئی کمرے میں بند رہنے پر مجبور ہوں۔ ہر چیز مجھے ڈراتی ہے جیسے کوئی نظر نہ آنے والا آدمی ہر جگہ موجود ہے کبھی وہ دروازے کا پٹ کھولتا ہے اور جب ظہر کے وقت سب سو رہے ہوتے ہیں تو پھر وہ آ جاتا ہے کبھی وہ کھڑکی کے شیشے کے پیچھے ہوتا ہے اور کبھی وہ خود کو ماں کی سکرٹ کے پیچھے چھپا لیتا ہے۔ آج صبح وہ آئینے میں تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔ مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے کھانسی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ماں کو اب ڈاکٹر کوثری پر اعتماد نہیں رہا وہ اس کی دوائیاں دور انڈیل ڈالتی ہے۔ ماموں ڈاکٹر رات کو ہمارے گھر ہی میں سوتے ہیں۔ یہ طے ہوا ہے کہ ایک رات مجھے وہ ٹیکہ لگائے گا اور ایک رات ماں۔ ابو کہتے ہیں کہ یورپی ڈاکٹر انتہائی ماہر ہیں۔ پہلے ہی نسخہ میں بیماری کا علاج کر دیتے ہیں۔ پھوپھی آذر مجھے اداس نظروں سے دیکھتی ہے اور میرے سر اور چہرے کو اس طرح چومتی ہے جیسے وہ مجھے دوبارہ نہیں دیکھے گی۔ حسن آغا کے پاس ایک پرانا پوسٹ کارڈ ہے جس پر ایک موٹی، سنہری بالوں والی عورت کی تصویر ہے۔ حسن آغا کہتا ہے کہ یہ ملکہ پیرس ہے اور بدفطرت عورت ہے یہ قرآن اور حضرت محمد ﷺ پر اعتقاد نہیں رکھتی۔ حسن آغا میرے اور امی کے بارے میں پریشان ہے اور دادی جان سے چاہتا ہے کہ ہمیں اس کافر ملکہ کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے وہ صبح شام نماز پڑھے۔ ماں خوشی خوشی سفر کے بیگ تیار کرتی ہے میں جانتی ہوں کہ پیرس میں بھی خوف ہے اور میں جہاں کہیں بھی جاؤں گی خوف میرے پیچھے آئے گا۔ دادی جان مسلسل نماز پڑھتی ہے اور میرے چہرے پر پھونکیں مارتی ہے۔ طوبیٰ خانم

ہر روز پکائے ہوئے آب جگر کا ایک گلاس مجھے دیتی ہے۔ میری گردن اور ٹانگوں سے ہزاروں قسم کی دعائیں بندھی ہوئی ہیں۔ میرے سرہانے کے نیچے بے شمار تہہ کیے ہوئے کاغذ ہیں۔

اب بھی چار بجے بعد از ظہر سکول سے چھٹی ہوجانے کے بارے میں سوچتی ہوں کہ آدھ بھولے ہوئے خواب کی طرح دُور سے بس آرہی ہے اس سے پہلے کہ میرے پاس پہنچے ایک سفید غبار میں گم ہوجاتی ہے۔

ابھی سونے سے پہلے میں دل میں اس بات کا اعادہ کرتی ہوں ''میں کسی بس پر سوار نہیں ہوں گی سوائے عزیز آقا کی۔'' یہ وہ عہد ہے جو ہم نے آپس میں کیا ہے اور میں قیامت تک اس عہد کی وفادار رہوں گی۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ قسم کھانے کے وقت میں آنکھیں بند کرلیتی ہوں۔ اپنی سانس روک لیتی ہوں اور میرا دل ڈھول کی طرح بجنے لگتا ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ عزیز آقا اس تھاپ کو سن رہا ہے اور اس کا جواب دے گا۔

تین دن بعد ہم جائیں گے۔ دادی اماں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہے اور یاسمین کے پھول دھاگے میں پرو رہی ہے اور ان سے میرے لیے ہار اور چوڑیاں بنائے گی۔ سب کتنے اداس ہیں۔ حتیٰ کہ طوبیٰ خانم جو ہمیشہ ناراض رہتی تھی اور منہ پھلائے رہتی تھی، پہلے جیسی نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں اور اپنے دوپٹے سے ناک صاف کررہی ہے۔

دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ سے کہتی ہوں کہ لازماً نیا ڈاکٹر ہوگا یا پھر پھوپھیوں میں سے کوئی ایک ہوگی۔ میری عیادت کے لیے سینکڑوں قسم کے لوگ آتے ہیں اور سارا دن دروازے پر دستک ہوتی رہتی ہے۔

حسن آغا کمرے میں آتا ہے اور دروازے کے پاس کھڑا ہوجاتا ہے، وہ حیران و پریشان مبہوت ہوکر ماں کو دیکھتا ہے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اسے جرأت نہیں ہوتی۔ ہمیشہ کی طرح ڈر سے سسکیاں لینا شروع کردیتا ہے وہ دروازے کی طرف کسی آدمی یا کسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن اس کی آواز نہیں نکلتی۔

ماں پریشان اور بے حوصلہ ہے۔ اُٹھ کر دروازے سے برآمدے کی طرف جاتی ہے مجھے اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ''کون؟''

حسن آغا کا جواب سنائی نہیں دیتا فقط ماں کی آواز بلند اور بلند تر ہوتی جارہی ہے اور خطرے کے سائرن کی طرح سب کو پریشان کردیتی ہے۔ دادی اماں اُٹھتی ہے اور کھڑکی بند کردیتی ہے۔ کمبل میری ٹھوڑی تک اوڑھا دیتی ہے۔ دوبارہ ماں کی آواز سنائی دیتی ہے ''بس ڈرائیور''

میرا دل اپنی جگہ سے اُکھڑ جاتا ہے، میں اُٹھتی ہوں اور اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہوں حسن آغا کا جواب اس بھیڑ کی ''میں میں'' کی طرح ہے جسے ذبح کیا جارہا ہو۔ ماں کی پکار میرے سر میں گھوم رہی ہے ''کون؟ کیا؟ کون سی بس؟''

حسن آغا ادھ موا ہوکر آئیں بائیں شائیں کررہا ہے۔ ماں کا شوروغل مجھے سنائی دے رہا ہے جو یہ جاننا چاہتی ہے کہ ایک قلاش ڈرائیور کو کس طرح اس کی بیٹی کی عیادت کرنے کی جرأت ہوئی ہے۔

حسن آغا کو بھیجتی ہے کہ اسے جاکر کہے کہ اگر وہ دوبارہ اس طرف آیا تو وہ اس کی ٹانگیں تڑوا دے گی۔ میں کمبل اتار دیتی ہوں۔ اچھل کر بستر سے اُٹھتی ہوں، ننگے پاؤں، شب خوابی کا باریک لباس پہنے برآمدے کی طرف دوڑتی ہوں طوبیٰ خانم مجھے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ میں اسے دھکا دیتی ہوں اور اس کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹتی ہوں۔ ماں میرے عجیب وغریب رویہ پر حیران و پریشان، مجھے حکم دیتی ہے کہ میں واپس اپنی جگہ پر چلی جاؤں۔ میں ماں کی دھمکیوں سے لاپروا دوڑتی دوڑتی باپ کے دفتر والے کمرے میں جاتی ہوں جو برآمدے کے آخر میں ہے وہاں جاکر اندر سے تالا بند کردیتی ہوں۔ اس کمرے کی کھڑکی گلی میں کھلتی ہے۔ پردہ ہٹاتی ہوں۔ کرسی پر چڑھ کر کھڑکی سے دیکھتی ہوں۔ وہاں گلی کے درمیان عزیز آغا ایک مظلوم اور شرمسار بچے کی طرح اُمید وبیم کی حالت میں کھڑا ہے۔ ایک چھوٹا سا پیکٹ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے اپنے پریشان بالوں کو کنگھی کی ہوئی ہے اپنی قمیض کے سارے بٹن بند کیے ہوئے ہیں وہ نہیں چاہتا کہ اس کے سینے پر گودی ہوئی تصویریں کسی کو نظر آئیں۔ میں کھڑکی کھولتی ہوں۔ میں اسے آواز دیتی ہوں وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور اپنی راہ چل پڑتا ہے میں اور زیادہ اونچی آواز میں اسے پکارتی ہوں اور اس کی طرف ہاتھ ہلاتی ہوں۔ وہ گھوم کر اپنا سر اُٹھاتا ہے اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی ہے۔ اس کی پرانی شفقت اس کے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔ میرے آنسو تیزی سے بہنے لگتے ہیں اور مجھے خود اپنی باتوں کی سمجھ نہیں آرہی۔ عزیز آغا وہیں کھڑے کھڑے سر ہلا ہلا کے مجھے سلام کرتا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کس قدر خوش ہے! وہ آگے آتا ہے، آگے میری طرف۔ وہ رکتا ہے اور گردوپیش اور گھر کے دروازے کی طرف دیکھتا ہے پیکٹ اس نے مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ پھر وہ اور آگے آتا ہے وہ کھڑکی کے نیچے ہے اور اس کی قدیمی مستقل بو مجھ تک آرہی ہے۔ میں جھکتی ہوں لیکن میرا ہاتھ پیکٹ تک نہیں پہنچتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے سینے پر گودی ہوئی تصویروں کو چھوؤں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اسے ماں، پھوپھی آذر، طوبیٰ خانم کو جاکر دکھاؤں اور ڈر سے ان کا جگر پھٹ جائے۔ عزیز آقا مجھ سے بھی زیادہ خوش ہے۔ وہ سر اوپر کی طرف بلند کرتا ہے اور ہنستا ہے۔ اس کی ہنسی کے ساتھ ہی ایک عجیب اتفاق پیش آتا ہے۔ اس کے ہونٹ کھلتے ہیں اور پھر مجھے اس کی ناک اور آنکھیں نظر نہیں آتیں اس کا منہ ایک غار کی طرح تاریک ہے۔ میں ڈرتی ہوں اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ میں گرم ہوجاتی ہوں اور میرا جسم پسینے میں شرابور ہوجاتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے جہاں میں کھڑی ہوں یہیں سے اس تاریک غار میں کود جاؤں جس سے ناقابل یقین آوازیں اور بوئیں آرہی ہیں۔ جہاں تک ہوسکتا ہے اپنا بدن کھڑکی سے باہر نکالتی ہوں۔ نیچے جھکتی ہوں، سر کو جھکاتی ہوں۔ عزیز آقا میرے چہرے کے نیچے ہے اور اس کے میلے ہونٹوں کے درمیان ایک سنہری دانت الہ دین کے چراغ کی طرح جگمگ کررہا ہے۔ مجھے یقین کہ اس طلسمی چراغ سے جو کچھ چاہوں حاصل کرسکتی ہوں۔ میں آنکھیں بند کرلیتی ہوں اور خواہش کرتی ہوں کہ دوبارہ صحت مند ہوجاؤں۔ میری کھانسی بند ہوجاتی ہے اور میرا خوف غائب ہوجاتا ہے۔

جب ہم پیرس پہنچے تو ''ہوٹل واگرام'' میں کمرہ لیا۔ تین دن بعد فرانسیسی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور میرے لیے ایک تفصیلی نسخہ تیار کیا۔ میری حالت اس سے بہت پہلے ٹھیک ہوگئی تھی اور میری کھانسی کم ہوگئی تھی۔ کسی کو بھی میرے اور طلسمی چراغ کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ ماں میری صحت یابی کو ڈاکٹر کی قابلیت کا نتیجہ سمجھتی تھی لیکن خود مجھے پتہ تھا کہ کس نے اور کس چیز نے مجھے صحت یاب کیا تھا۔ میں ہر رات کو کمرے کی تاریکی میں چادر کے نیچے الہ دین کے تصوراتی طلسمی چراغ پر ہاتھ پھیرتی تھی اور اپنی ہمیشہ والی دعا دہراتی تھی۔

پیرس میں ہمارے قیام کو چھ ماہ گزر گئے ہم وہاں اس قدر ٹھہرے کہ میں بالکل صحت یاب ہوگئی۔ ماں نے اپنی شاپنگ مکمل کی۔ باپ نے تمام میوزیم دیکھ ڈالے اور پیرس کے چڑیا گھروں کے جانوروں کو نزدیک سے شناخت بھی کرنے لگے۔ جب ہم تہران پہنچے تو میرا اسکول تبدیل کر دیا گیا اور میرا نیا سکول ہمارے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں پیدل جاتی تھی اور پیدل ہی واپس آتی تھی لیکن سڑک عبور کرتے وقت میرا دل اور نگاہیں، شمیران والی بس کی متلاشی رہتی تھیں۔

سال تیزی سے گزرتے گئے اور میں ایک محترم دوشیزہ میں بدل گئی۔ پرانی بسوں کو بند کر دیا اور ان کی جگہ نئی ٹیکسیوں نے لے لی جن کے ڈرائیور نوجوان تھے۔ اطراف کی خالی زمین پر چھوٹے بڑے گھر بن گئے اور محلّہ کے بچے بھی اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ماموں کے بچے امریکہ چلے گئے اور یہ طے ہوا کہ مجھے بھی تعلیم مکمل کرنے کے لیے بھیجا جائے جہاں جانا ہوتا میں ماں کی کار اور ڈرائیور کے ساتھ جاتی اور بہت کم بس پر سوار ہوتی۔ میں جوانی کے دنوں کے باعث مسحور و مبہوت تھی اور میرے سامنے مستقبل کی قوس قزح پھیلی ہوئی تھی۔ ہر وقت ایک نیا حادثہ پیش آجاتا اور میں تہ و بالا ہو جاتی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ، ماں کے چہرے پر بہت سی چھوٹی چھوٹی جھریاں آجانے، حسن آغا کے بال سفید ہو جانے، والد کی وفات، شادی اور طلاق، سفر اور پردیس میں رہائش کے باوجود، قدیمی اور بزرگ دوست کے ساتھ کیے گئے عہد کی وفادار رہی ہوں۔ جب کبھی میرا دل بجھ جاتا یا کسی طرف سے دکھ پہنچتا یا کام میں رکاوٹ آجاتی، اچانک بچپن کی یادوں کے پیچھے سے میرے دوست کا معجزہ نما منہ نمودار ہوتا اور اس کا سنہری دانت زہرہ ستارہ کی مانند میری تاریک راتوں میں چمکنا شروع کر دیتا تھا۔

بس نمبر ستر موڑ سے نظر آرہی ہے اور آہستہ آہستہ ہمارے سامنے آکر رکتی ہے۔ میرے کانوں میں بچگانہ آواز گونج جاتی ہے۔ ''میں سوائے عزیز آغا کی بس کے کسی بس میں سوار نہیں ہوں گی۔''

میری بیٹی مجھ سے آگے جاتی ہے۔ ڈرائیور کے لیے ہاتھ ہلاتی ہے اس کی آنکھیں شریر اور پراسرار سوچوں سے پُر ہیں۔ شاید اس کا بھی کوئی راز ہے جو وہ مجھے نہیں بتاتی اسی طرح جیسے میں نے کسی سے نہیں کہا تھا نہ ماں سے، نہ حسن آغا سے حتیٰ کہ باغ کے وسط میں واقع تبریزی درختوں سے بھی۔

رانی آکاش ہاشمی

بانجھ زمین

اب دیکھنا یہ تھا کہ چوہے اور بلی کی اس جنگ میں جیتا کون اور ہارا کون؟ وہ عمر میں اس سے بڑی تھی۔ زندگی سے بھرپور تھی اور تجربات و مشاہدات میں اس سے سینئر بھی جبکہ وہ نوآمیز، کم عمر، خوش شکل اور مسلسل اس بات کا متقاضی کہ وہ اس سے چالاک ہے۔

حسن آراء عمر کی وہ بہار جس کو عموماً جوانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ گزار کر فارغ ہوئی تھی۔ سیاہ رنگ میں بال رنگنا بھی اس نے ابھی تھوڑا عرصہ پہلے ہی شروع کیے تھے۔ لپ اسٹک کی تہیں گہری سے گہری ہونے کے باوجود ہونٹوں کی تازگی و شادابی رس نچوڑے ہوئے لیموں کی مانند تھی۔ جسم ڈھل ڈھل کر تقریباً ڈھل جانے کے قریب تھا اور وہ ٹوٹی ہوئی ادوائن کی مانند کبھی ادھر کبھی ادھر سے کس کر اسے مضبوطی سے باندھنے کی فکر میں لگی رہتی، مگر عمر کے بہاؤ کو کون روک سکا ہے۔ عمر کے دن جب گرتے ہیں تو انگلیوں پر گننے کی نوبت نہیں آتی۔

حسین عورتوں کا یہی تو المیہ ہے جب جوانی ہوتی ہے تو آنکھیں نشے سے کھلتی ہی نہیں۔ ہزار طرح کے ترتراتے جملے سننے کے بعد شوہر کے سیدھے سادھے جملے ہضم ہی نہیں ہوتے۔ بیچارہ اک بھولی سی مسکراہٹ کے حصول کے لیے سر کے بل دوڑا چلا آتا ہے۔

کم رُو لڑکیاں البتہ ان کے قبضے میں خوب آتی ہیں۔ تمام تر ہٹ دھرمیوں کا نزول بھی انہی پر ہوتا ہے۔ ادھر شوہر نے تاریکی میں دو محبت بھرے بول بولے ادھر یہ مدہوش صبح ہونے پر تاریکی چھٹتی تو دل سمجھوتے پر گزر جاتا یا پھر بہت سی تو سپردگی ہی میں زندہ رہتیں اور سپردگی کی اس کیفیت میں جس گھر میں ڈولی اتری اس میں ''جنازہ'' کے مصداق قبر میں جا اتریں۔

حسن آراء نے باقاعدہ شادی تو نہیں کی تھی مگر شادی کے تمام تر پیچ و خم سے وہ بخوبی آشنا تھی۔ اوائل جوانی ہی سے جب وہ سہیلیوں سے اس سلسلے میں بحث کرتی تو وہ اس کے تجربات پر حیران ہوتیں وہ لاکھ سمجھاتی کہ یہ اس کا تجربہ نہیں مگر وہ مانتی ہی ناں، اصل میں یہ اس کے اندر کا وجدان تھا کہ بہت ساری باتیں اس کو پہلے ہی سے معلوم ہوگئی تھیں مثلاً وہ ماں تو نہیں بنی تھی، مگر ماں کے جذبات کی گہرائی کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کے بچے نہیں تھے مگر نہ جانے کیوں اسے ایسے لگتا جیسے اس کے اندر کوئی بچہ ہے جو دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، وہ پہروں اس بچے کی قربت کے لیے شدت سے مچلتی جس نے اس کی گود سے جنم لینا تھا۔ اس نے اس بچے کا نام بھی رکھ چھوڑا تھا۔ منا، ہنی، ککو، ہاشو اور پتا نہیں کیا کیا۔ وہ اکثر زیادہ رونے پر اسے ڈانٹ بھی دیتی اور زیادہ ہنسنے پر جھک کر اس کے ہونٹوں کا بوسہ لے لیتی۔ اسے سینے سے لگا

لیتی یہ الگ بات کہ یہ بوسہ ہوا ہی میں معلق ہو جاتا زمیں پر گرنے یا آسمان پر اٹھنے کی بجائے۔

اسے بانجھ عورتوں، بنجر زمینوں، سوکھے پودوں، ویران وادیوں اور سنسان گھاٹیوں سے انتہا درجے کی نفرت تھی مگر اب ایک عجیب طرح کا خوف اس میں سما گیا تھا اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کا اپنا جسم ایک ویران کھیتی کی مانند ہے جو شاید کبھی کوئی پھول نہ کھلا سکے۔

یہ احساس اسے بہت عرصہ پہلے ہی ہو گیا تھا جب اس نے ڈاکٹر کی بات پر کان نہ دھرنے اور مسلسل علاج کا تقاضا کرنے والے ٹی بی کے لاعلاج مریض کی طرح شبیر حسین کو ہانپ ہانپ کر نچوڑا اور اس میں وہی زندگی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اسے یونہی شک سا تھا کہ وہ بانجھ ہے لیکن پھر بہت سارے مردوں کی فہرست کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد اسے پتا چل گیا کہ اس کے اندر دور کہیں کائی جم چکی ہے اس نے تندہی سے تازہ چہروں کی آڑ لے کر اس کائی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اب بھی کہیں نہ کہیں حالات کے ستائے، غم دوستاں کے مارے، اس کے سائے میں پناہ لینے کی کوشش کرتے وہ بڑھ کر انہیں تھامتی اور اس کائی کے خاتمے کے لیے ان کی مدد لیتی لیکن اس کو آج تک یہ سمجھ نہ آئی کہ وہ مدد لے رہی ہے یا دے رہی ہے شاید لے رہی ہو یا پھر شاید دے رہی ہو۔

وہ اکثر سوچتی کہ اس کے ماں باپ جو اب منوں مٹی تلے سو رہے تھے ان کی کامیاب محبت کا راز کیا تھا۔ اس کا باپ ہمیشہ اس کی ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی اور کچی مٹی کی ہانڈی کو ترجیح کیوں دیتا تھا۔ یہ اور اس طرح کے اور بہت سے لایعنی سوالات اس کے اندر سے ابھرتے رہے جن کے جوابات اسے کوئی نہ دے سکا۔

انہی میں سے ایک سوال اس کم عمر بانکے کا تھا جو کھنڈر کو دیکھ کر عمارت کا اندازہ لگانے کے مصداق چوکھٹ پر چلا آیا تھا اور وہ اس کی ہم عمر لڑکیوں کی طرح خوامخواہ کتراتی گھبراتی رہتی۔ دراصل اس کے سامنے اسے اپنی عمر اچانک ہی بڑی، ہڈیاں شکستہ اور کھال جھریوں زدہ لگتی۔ صحن میں گھڑونچی پہ دھرے گھڑے میں پیالے کو اٹھانے کی کوشش، نظر پانی کی سطح پر پڑتی تو چہرے کے ڈینٹ بھی نظر آ جاتے۔ وہ یہ ڈینٹ دیکھنے کی عادی تھی اس لیے پریشان نہ ہوئی لیکن حیرانی تب ہوئی جب ان ٹیڑھے میڑھے خطوط کے ساتھ ایک اور عکس بھی اپنی جھلک دکھانے لگا۔

بچپن میں پڑھی گئی کہانی ''لالچی کتا'' اور اس کا انجام اس کے ذہن میں تھا سو وہ اکثر اس عکس کو جھٹک دیتی۔ لیکن جب ایک عرصے کے بعد یہ عکس اس کی ذات کا حصہ بن گیا تو تفکر بھرے انداز میں وہ اکثر اپنے بازو پر چٹکی بھرنے لگی۔

اس عکس سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے وہی کیا جو کہ وہ کر سکتی تھی۔ یعنی اس نے گھڑے ہی کو توڑ دیا توڑنے پر سارا پانی آنگن میں بہہ نکلا۔ چھم چھم سے بہتے پانی کو دیکھتی رہی پھر نہ جانے کیا ہوا۔ پنڈلیوں سے شلوار اٹھا کر پنڈلیاں ٹھنڈے بہتے پانی میں رکھ دیں۔ گھڑے کا پانی حد درجہ ٹھنڈا تھا کیونکہ

اپنی ماں کی طرح سے اسے بھی دوروزہ ٹھنڈا باسی پانی پینے کی عادت تھی لیکن آج اسے پینے سے زیادہ ٹانگوں پر لگانے میں زیادہ فرحت محسوس ہوئی۔ یہ بات پھر بہت طول پکڑ جاتی ہے کہ اس عکس سے فرار حاصل کرنے کے لیے اس نے کیا کیا تدابیر اختیار کیں مگر یہ عکس خود بخود رنگ برنگی پنسلوں سے اپنے آپ کو بھرتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے خاتمے کی تدابیر بھی، مگر جیسے جیسے یہ کوششیں بڑھتی گئیں اس کے اندر بچے کی دھاڑیں اور زور زور سے سنائی دینے لگیں، وہ اتھاہ گہرائیوں میں اسے میرا بچہ میرا لعل کہہ کر تھپکی دیتی اور یہ تھپکی بھی بوسے کی طرح ہی سے ہوا میں معلق ہو جاتی۔

ان بے وزن تھپکیوں اور بے ذائقہ بوسوں سے پیچھا اسے تب چھوٹتا محسوس ہوا جب اس نے دالان میں بچھے پلنگ پر اپنی آغوش میں اس کے جسم کی خفیف سی لرزش محسوس کی۔ وہ دبک کر نجانے کیوں سہما سا لگ رہا تھا، لیکن یہ کیفیت صرف ایک لمحے کے لیے تھی اگلے ہی لمحے حسن آراء کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا وجود کسی طوفان، زلزلے یا پارے کی طرح سے متحرک ہو گیا ہو۔ عرصے سے سویا ہوا اس کا اپنا جسم نہ جانے کیسے پوری نیند لے کر بیدار ہو چکا تھا، دل کی اعتدال پر آئی دھڑکن اتھل پتھل ہو چکی تھی، وہ اس کی لٹ کو جس میں ایک دو سفید بال چمک رہے تھے اپنی انگلی پر لپیٹ رہا تھا۔

''تمہارا نام حسن آراء کس نے رکھا''؟ سوال اپنی عمر ہی کی طرح سے معصوم اور کم عمر تھا۔

''تمہارے چہرے پر بھی یہ بنا ہوا خط بہت اچھا لگ رہا ہے اگر تمہاری مونچھیں ہوتیں تو تم کتنے حسین لگتے''

''اب نہیں ہوں۔''

ایک دم سے اس کے اندر بیٹھا بچہ زندگی میں پہلی بار قلقاری مار کر کھلکھلا کر ہنسا۔ میرا بچہ میرا لعل ہنی، ککو، ہاشو اس نے بڑھ کر اسے تھپکی دی اور پیشانی کا بوسہ لیا لیکن اب کی بار یہ بوسہ ہوا میں تحلیل ہونے کی بجائے اس کے اندر ہی کہیں گم ہو چکا تھا اور زندگی میں پہلی بار اس نے خواہش کی کہ یہ بوسہ کبھی نہ مرے اس کی روح کے اندر ہی رقص کرتا رہے۔

(ملتان آرٹس فورم کے اجلاس منعقدہ ۹ رجنوری ۱۹۹۹ء میں پڑھا گیا)

احمد ندیم تونسوی

ذِکرِ صَبُو

رسالہ دریادِ اُستادِ محترم شمس الحُمقاء، اَخفشِ زَماں، تلمیذ الجالینوس جناب عبدالصبور المتخلص صَبُو (خلد آشیانی، جنت مکانی)

یہ بندۂ عاصی ہدفِ آفاتِ اَرضی وسَماوی، ننگِ علم و دانش ہے اور جس سے نوری یا ناری ہونے کا فطری اختیار ایک شاعر نے محض اپنے شعر میں زور پیدا کرنے کی خاطر (راقم کی) پیدائش سے پہلے ہی چھین لیا تھا۔ مگر یہ مقام بھی شکر کا ہے کہ اس عاجز وکمترین پر چرخِ نیلی فام ہمیشہ ہی مہربان رہا ہے۔ جہاں تک علم و دانش، طِب وحکمت اور شعر و اَدب کا تعلق ہے، یہ ناچیز بغیر کسی تردّد، تشکک اور تذبذب کے، یہ جسارت کرسکتا ہے کہنے کی کہ زینہ ہائے علوم وفنون پر پہلا قدم نابغہ روزگار عالی مرتبت جناب عبدالصَبو ربمعروف ومتخلص صَبُوؔ، کہ مرحوم ومغفور شاعری سے بھی شغل فرماتے تھے، کے توسط سے رکھا۔ آپ زمانہ چشیدہ، مَردم (زَن) گزیدہ اور ستم رسیدہ تھے چنانچہ گوشۂ پناہ شعر وادب ہی میں ملا۔ فنِ تقطیع اور علمِ عروض میں فہمِ عمیق رکھتے تھے۔ حد یہ کہ روزمرہ گفتگو اور بحث مباحثوں میں بھی آپ کے جملے بحرِ عروض کے آبِ صفا میں دُھلے ہوتے تھے۔ خود کو اَخفش سے زیادہ خوش قسمت سمجھتے تھے کہ اُس کے پاس ایک بکری تھی۔ اِن کے پاس دو تھیں۔ زمین چور شعرا کا غول اور بستی کے دوسرے مَلاعین و چپڑ قناتین، استادِ محترم کی ذات کے خلاف، اپنی سوختہ دِلی کے سبب اور سفلے پَن سے مجبور روز وشب بَرسرِ دَشنام وپیہم آمادۂ فساد رہتے۔ آپ جبر ومقابلہ میں بھی شُد بُد رکھتے تھے۔ چنانچہ ازدواجی مسائل وقُضَایا کے حل کے لیے الجبرا سے رجوع کرنے کی جسارت ہائے صدقِ دل کرتے اور پھر اسی طرح دستارِ عزت و فضیلت زوجہ محترمہ، کہ اب وہ بھی مرحومہ ہیں، سے گردِ ذلت میں رسید کرواتے۔

پانچویں جماعت میں صَدرِ مُدرس کی چھاچھ کی لٹیا چرانے کے سلسلے میں مدرسے سے اخراج کا صدمہ سہنے اور کم وبیش برس لنڈورا پھرنے کے بعد اِس عاصی کو استادِ محترم نے اپنے سایۂ التفات میں لے لیا۔ سِن اس وقت تیرہ نہیں تو چودہ برس ضرور ہوگا جب راقم نے خلد آشیانی استادِ محترم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اپنے حلقۂ تربیت بڑے مشاغلِ قبیحہ میں قبولنے کے بعد رسمِ مہورت ادا فرمائی۔ چند برگِ خشک نسواری تمباکو کے بدستِ خود مسل کر اپنے محبوب حقے کی چلم میں تہہ لگائی۔ تب اک تولہ و زیرستانی چرس کہ جس کا رنگ سیاہی مائل سبز اور رُوواں سنہری تھا کہ ایک دبیز تہہ لگا کے اس پر دہکتا ہوا انگارہ رکھا اور آہستہ آہستہ مگر جاندار کش لینے کے اسرار ورموز سے آگاہ کرتے ہوئے میری پیٹھ پر شفقت بھری تھپکی دی اور حوصلہ بندھایا کہ راقم جہانِ خمار میں نوآموز اور نووارد تھا اور منہال میری طرف بڑھا دی

تب جو چند جملہ ہائے تحسین وآفرین درطریقۂ استعمال ولطف وخمارِ چرس سلیس پیرائے میں ادا فرمائے، وہ ذیل میں درج کیے دیتا ہوں تاکہ ناآموز چرسیوں کے لیے خضرِ راہ ثابت ہوں اور اِن سے استفادہ کرسکیں:

> ''عزیزم! چرس کا خمار جب تک انگلیوں کی پوروں تک سرایت نہ کرے چرس اپنا رنگ نہیں جماتی، جب رنگ جم جائے تب پوریں نہیں رہتیں اور جو رنگ جمنے کے بعد رومانس کی طرف رجوع نہ کرے اسے نطفۂ بے تحقیق جاننا چاہیے۔ چرس کا اِٹھلاتا ہوا کش لگانا اور اسے بحفاظت پھیپھڑوں تک لے جانا اک فن ہے۔ جس کے اکتساب کے لیے ایک عمر یا پھر استادِ کامل چاہیے اور تم عزیزمن خوش قسمت ہو کہ تمہیں سرد وگرم چشیدہ استاد مہیا ہے جو صرف تائیدِ غیبی سے ہی ممکن ہے۔ جب تک چرس کا نرم لطیف دھواں پھیپھڑوں کی دیواروں کی اٹکل سے گلے نہ ملے تب تک چرس، پھیپھڑے اور دمہ تینوں ناراض رہتے ہیں اور ہر کش کو آخری کش اور روح کش سمجھو اور یہ جان لو کہ چرس کا شغل انتہائی نازک شغل ہے۔''

ابا مرحوم کہ استادِ محترم کے ہم پیالہ تھے (یہاں مراد بھنگ کا پیالہ ہے) نے اِس بات پر مسرت کا اظہار فرمایا کہ پِدر نے چرس کا پہلا کش اس وقت لگایا جب عمر بیس سے متجاوز تھی جبکہ پِسر نے (اشارہ راقم کی طرف ہے) مدارج ہائے لذتِ افیون و چرس میٹھے برس سے قبل ہی طے کرلیے اور عمر بھر راقم کی ترقیوں پر اترایا کیے۔

جب ہیبت مآب اوڈلف ہٹلر شورہ پشتی پر آمادہ ہوا اور سلطنتِ انگلشیہ، جس پر سورج نے ہمیشہ چمکا رہنے کا وعدہ کر رکھا تھا، پر مائل بہ فساد ہوا تو استادِ محترم نے ملکہ معظّمہ کو اپنی خدمات پیش کیں اور یوں آپ کا ملتان چھاؤنی میں فوجی اصطبل کے سائیسِ اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر تقرر ہوا۔ یہیں آپ نے ایک گورے بٹلر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور زبانِ وائسرائے میں اے بے تبے رواں کیا اور یہیں آپ نے بسیار خوری اور سَتِ نیشکر (گڑ کو اِسی نام سے یاد فرماتے تھے) کی نذر ہونے والے دندان کی جگہ ایک بتیسی اپنے بے آب وگیاہ جبڑوں میں ایک فرنگی دندان ساز (سکنہ ملتان چھاؤنی) سے بعوض ایک عدد خنزیرِ جنگلی نصیب کروائی جسے (خنزیرِ جنگلی کو) بقول ان کے انہوں نے بَرلبِ چناب دوعدد عصا ہائے بانسی کی معاونت ومدد سے بھور بھئے جہنم اور سانجھ پڑے فرنگی واصل کیا تھا۔

استادِ محترم فرماتے تھے کہ حکماء یونان کے ملفوظات میں درج یوں تو بسیار خوری کے لاشمار فائدے ہیں لیکن دو جیّد فائدے علاوہ ازیں ہیں۔ ایک تو بسیار خوری سے دانت مضبوط رہتے ہیں اور دوسرا یہ کہ دشمنان اور رشتے دار بھی ذرا فاصلے پر رہتے ہیں۔ بسیاری خوری کے سبب دندان کی مضبوطی کا جہاں تک تعلق ہے ہے تو ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' والی بات ہے کہ استادِ مرحوم نے اس بتیسی (ساختہ فرنگی) کو کم وبیش تیس برس استعمال فرمایا۔ کہتے تھے کہ آج کل کی کاغذی بتیسیوں سے تو سلیقے سے سیٹی بھی

نہیں بجائی جاسکتی۔ وہ بستی کی پہلی، اکلوتی اور تاریخی بتیسی تھی۔ اِس سلسلے میں بستی کے طواغیت وشیاطین نے یہ اشغلا چھوڑ رکھا تھا کہ بتیسی مذکورہ میں اس چرندے کے دانت نصب ہیں جس کی چربی کے کارتوسوں نے مسلمانانِ ہند کو پہلی بار آزادی اور غلامی کا فرق سمجھا کر جنگ پر (بادلِ نخواستہ) مجبور کیا تھا۔ ورنہ عام یا نقلی دانت نہ اتنا کاٹ سکتے ہیں اور نہ اتنا چبا سکتے ہیں۔ بعض افواہ ساز تو یہ بھی کہتے تھے کہ اتنے کشادہ جبڑوں میں بتیس دانت ہو ہی نہیں سکتے یقیناً پینتیس یا چھتیس دانت ہوں گے۔ اس پر بستی کے افواہ ساز دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ گروہ جو یہ کہتا تھا کہ بتیسی نہیں بلکہ چھتیسی ہے دوسرا وہ گروہ جس کی تحقیق کے مطابق پینتیسی تھی۔ سچ کہا ہے فرزانوں نے، جب کوئی قوم روبہ زوال ہوتی ہے تو وہ گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ مگر کسی فارسی کے شاعر نے اس سے بھی بڑھ کر سچ کہا ہے

آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدارا

اور استادِ محترم اُن کے سفلے پن سے بے نیاز کاٹا کیے، چبایا کیے اور مسکایا کیے۔

فارسی سے یاد آیا۔ استادِ محترم نے سخن فہمی اور فارسی صرف ونحو کی تعلیم ایک ایرانی سنگ فروش (جسے کسی چشمک کی بنا پر ہم عصر سگ فروش کہنے کو ترجیح دیتے تھے) سے حاصل کی تھی۔ جو بقول اُن کے اُن کو دورۂ ملتان کے دوران بہاء الدین زکریاؒ کے مزار پر ملا تھا جہاں وہ لنگر کی تقسیم پر مامور تھا۔ آپ ہمیشہ اپنے استادِ محترم کو شاید کسی ادبی یا تاریخی تلازمہ کی بنا پر ملا عبدالصمد ثانی کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ طب وحکمت میں اپنے تئیں خود کو تلمیذ الجالینوس خیال کرتے تھے۔ اگر کوئی دوسرا تائید کرتا تو کانوں کو ہاتھ لگاتے اور چہرے پر استغفاریت والے تاثرات پھیل جاتے۔ یہ تو آج کل کے کل جُگ میں کلوں اور اوزاروں کی معاونت سے مرائض کی تشخیص ہوتی ہے۔ ورنہ جنت مکانی مریض کے کھانے کی محض تفصیلات اور جزئیات سن کر ہی مرض کو جڑ سے پکڑ لیتے تھے اور مریض کے خون میں موجود کسی وراثتی بد پرہیزی یا اس کی ذاتی عذائی حکمت (بد) عملی کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ آپ کی مرض شناسی کبھی بھی امراضِ معدہ سے آگے نہ بڑھنے پائی، کہ آپ کا عمر بھر معدہ کے جملہ مرائض سے سابقہ رہا۔ چنانچہ آپ کی حکمت اور حکمت عملی بھی، پرہیز سے لے کر دوا تک اور غذا سے لے کر ہوا تک، مرائض معدہ سے متعلق رہی۔

خلد آشیانی جب آتش جوان تھے اور دردِ کمر میں مبتلا ہونے کا میٹھا زمانہ تھا۔ جب حدت بھرے لمس کی چاہت میں راتوں کو پہلو اپنے آپ کو خود ہی بدلتے رہتے۔ وہ دوپہریں جب کان آپی آپ بجنے لگتے۔ وہ شامیں جب کانوں کی لوئیں کسی کے گرم سانسوں کو ترسا کرتیں۔ تب آپ نے بستی کی کسی دوشیزہ کو اپنے حلقۂ ازدواج کے لیے موزوں خیال نہ کیا اور جب جوانی کی سنہرے سکے چھن چھن گر کر ختم ہونے لگے اور آپ وسط العمری کے مرض میں مبتلا ہوئے تو اہالیان بستی نے آپ کو مجبور کیا کہ مولا بخش بھڑ بھونجے کی بیوہ سے دو بول پڑھوا لیجیے کہ

''وہ'' ہے تو درخشاں ہے حیات

اور یوں آپ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ منازل ہائے پیار دلار و جوتم پیزار فریقین نے سہاگ کے ارمانوں بھری رات ہی میں طے کر لی تھیں۔ ماہِ عسل کے اختتام تک آپ کی پریشانیوں میں اضافہ ہو چلا تھا۔

ہائے اُس زود پریشاں کا پریشاں ہونا

اور اِن پریشانیوں کو آپ نے چرس کی دھونی، افیم کی گلٹی اور بھنگ کے آبِ صفا سے دُور فرمایا۔ شادی کو حماقت اور ادھیڑ عمر کی شادی کو شمسۃ الحماقات کہتے تھے اور اسی عمر میں شادی کرنے کے بعد اپنے لیے شمس الحمقاء کا خطاب پسند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم جیسے عاصیوں سے اپنا درجہ بقلم خود ہی بلند کر لیا۔

آپ نے ہمیشہ اپنی سوانح عمری کو تاریخی عالمی واقعات سے جوڑے رکھا تاکہ واقعات کی ترتیب درست رہ سکے۔ روایت ہے کہ جس دن آپ کو بھینگی چمارن کے ساتھ قابلِ دشنام حالت میں ٹوہ دار بخشل جولاہے نے دھر لیا تھا اور بعد میں بستی کے خود ساختہ اور جعلی شرفاء نے آپ کی تواضع روایتی خرسواری اور رُخِ اسود کی خاطر چونے سے کی تھی (جاننا چاہیے کہ اِس موقع پر کالک کے استعمال کا مطلب استادمحترم کی حوصلہ افزائی تھا اور جس فعل کے آپ مرتکب ہو چکے تھے یا ہو رہے تھے وہ ہرگز ہرگز حوصلہ افزائی کے لائق نہ تھا)۔ اسی دن اقوام متحدہ کی داغ بیل ڈالی گئی کہ اقوامِ عالم کے مابین جنگوں کو قانونی جواز فراہم کیا جا سکے اور جس دن آپ نے بوجہ گلم جم (بھنگ نوشی کے ساتھ ساتھ چرس کے کش لگانا) فدا حسین پٹواری کی ترکی ٹوپی میں قے فرمائی تھی اسی دن کسی نے صدر کنیڈی کو گولی ماری تھی اور استادِ محترم اپنے زخموں کو تب تک سینکا کئے جب تک کنیڈی کے قاتل نے پکڑائی نہ دی۔

آپ کی نشست گاہ جس کو آپ دیوان خانہ اور زوجہ محترمہ مرکز الخبائث کے نام سے یاد فرماتی تھیں کے بیرونی دروازے پر ایک سال خوردہ چوبی تختی آویزاں تھی جس پر درج ذیل چتاونی خطِ نسخ میں درج تھی۔

''مرتکبِ دخل در معقولات بموجب قانونِ مروجہ مستوجب موآخذہ ہوگا۔'' صورتِ حال سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ چوبی تختی پر مرقوم چتاونی پڑھنے کے بعد دخل در معقولات سے باز رہنے کے لیے عالم عربی یا فاضل فارسی ہونا از بسکہ ضروری ہے۔ کیونکہ بستی کے لوگ اسے بہت ہی طاقتور قسم کا تعویذ سمجھ کر زیادہ توجہ کے لائق نہ سمجھتے تھے۔

استادِ محترم نے اپنے دیوان خانے میں کئی ایک قسم اور نسل کے حقے سجا رکھتے تھے جن میں ان کے محبوب حقے جس کو پیارے سے گڑگڑی پیچواں کہتے تھے کہ اعلیٰ مقام حاصل تھا جو یقیناً خاصے کی چیز تھا۔ آپ کی زوجہ محترمہ گڑگڑی پیچواں کو اپنی سوتن کے برابر مقام دیتی تھیں۔ وہ خود عمر بھر اس نظر کو ترسا کیں جس نظر سے استادمحترم اپنے محبوب حقے کو دیکھتے تھے اور اس لمس کو مرحومہ کا گلاب بدن تا دم مرگِ متمنی رہا جس لمس کا لطف اُن کا حقہ اٹھاتا رہا۔ گاہے ریح یا تبخیر معدے میں گھر کر لیتی تو حقے کا ہر کش

اندرونی حالات کی خبر معہ متعلقہ صوتی اثرات کے باہم پہنچا تا کہ

آتے ہیں نالوں کے جواب آخر

استادِ محترم کا محبوب گڑگڑی پیچواں، بموجب ان کی وصیت کے، بعد ان کے انتقال کے، اس عاصی کے حصے میں آیا۔ جس کو دیکھ دیکھ عاصی پہلے ان کی یاد اور پھر اِسے تازہ کرتا ہے۔ اب بھی اس کے صوتی اثرات میں آپ کی کھانسی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جو راقم الحروف کو دیر تک رنجیدہ کیے رہتی ہے۔

ایک دفعہ کسی اجل گرفتہ نے سفلہ پروری کی اور مرتکب غیبت کا ہوا کہ عاصی نے پیوستہ شب ٹھرّ ے سے شغل کیا اور بعد میں بخت بھری بھٹیارن کے ہاں رساتھ رات بسر کی جس نے صبح دم ایک پنجی اعلیٰ درجے کی ملتانی گجک بطور مختتانہ بھی راقم کے ساتھ کر دی۔ استاد محترم کا بلاوا آیا۔ بندہ حاضر ہوا۔ آپ اپنے دیوان خانے میں فروکش تھے۔ تین چار بھڑ بھونجے مصاحبی میں تھے۔ دیوان خانے میں چرس کی بو افواہ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ لال بھبوکا آنکھوں کا غلاف تھوڑ سا سرکایا اور اسکے بعد جو الفاظ آپ کے دہن سے برآمد ہوئے وہ حرف بہ حرف درج کیے دیتا ہوں:

''اے بد بخت دبلے انسان! پر چارک بوالہوسی! تُو لوگوں کے قہقہوں کا حقدار ٹھہرے۔ خلقِ خدا کے لطیفوں اور افواہوں میں جگہ پائے۔ عوام الناس کے ٹھٹھوں اور جگتوں کا ہدف بنے۔ اے کاش کہ افواہ کے حقیقت کا روپ دھارنے سے پہلے تُو یا افواہ، دونوں میں سے کوئی ایک جہنم واصل ہو جاتا۔ مگر تیرے ڈھلکے کندھے اور دست بہ کمر اس بات کے غماز ہیں کہ تو نے جنازہ اپنے کنوارپنے کا نکال دیا۔ افسوس اس بات کا بھی نہیں۔ دکھ اِس بات کا ہے جو کام افیون کر سکتی تھی اس کے لیے ٹھرے سے رجوع کرنا کوتاہ عقلی کی دلیل ہے اور مستزاد اس پر یہ، اے بد بخت بگلے نما انسان کہ تُو نے اس خادمہ فی سبیل اللہ سے مختتانہ بصورتِ گجک وصول کیا جو کہ حدت انگیز ہے۔ انسانی دماغ میں فاسد خیالات کی پرورش کرتی ہے۔ حیف ہے، حیف ہے۔''

اس کے بعد آج تک عاصی نے گجک کو چھوا تک نہیں کہ بقول استادِ محترم حدت انگیز چیزیں انسانی دماغ میں فاسد خیالات کو جنم دیتی ہیں اور مائل بہ منکرات کرتی ہیں۔

استاد محترم کا جسم مبالغے کی حد تک کشادہ تھا۔ آپ نے علم والا اصول عمر بھر خورد و نوش میں اپنائے رکھا یعنی جیسا ملے، جہاں ملے، جتنا ملے اور جب ملے نذرِ معدہ کرو۔ آپ کا جسم ماشاءاللہ مربع شکل کا تھا۔ جتنا شمالاً جنوباً تھا تقریباً اتنا ہی شرقاً غرباً۔ آپ بلا مبالغہ ایک خوش خوراک انسان تھے۔ کچھ بھی کھا کے بدمزہ نہ ہونا خوش خوراکی ہی کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔ بعض بدخو تو یہ بھی کہتے تھے کہ آپ کا جسم پولا ہے۔ آپ اپنے تن و توش کی بنا پر بستی کے سفلہ پروروں اور کینہ پردازوں کے سینے پر مرتے دم تک

روایتی مونگ دلتے رہے۔ بوقت نشستم جسم خود سے بھی نہ سنبھالا جاتا اور بوقت رفتم

جو چلے تو کوہِ گراں تھے ہم

والی صورتِ حال ہوتی۔

بستی کی سماجی زندگی، روشن خیالی کی جتنی متحمل ہو سکتی تھی استاد محترم نے ہمیشہ اتنی مقدار میں روشن خیالی کو روا رکھا۔ کہنا چاہیے کہ آپ کا طرزِ زندگی قطعاً دقیانوسی نہیں تھا۔ ہاں البتہ رنگ عبرت ناک حد تک آبنوسی تھا۔ اگر اپنی ہی حوصلہ افزائی مقصود ہوتی تو خود کو سانولا اگر عزت افزائی مطلوب ہوتی تو گندمی کی حد تک مبالغہ سے کام لیتے۔ گرمیوں میں جب ململِ مرمریں سے سر کو ڈھانپتے تو یوں لگتا جیسے کسی حلوائی نے نمائشی گلاب جامن کو چاندی کے ورق سے ڈھانپ دیا ہو۔ جب آپ مسکان فرماتے یا قہقہاتے تب ہی مخاطب آپ کے حدودِ اربعہ کے بارے میں اندازہ لگاتا۔ ان کے ذاتی دانت (مصنوعی بتیسی کو ذاتی دانت کہتے تھے) ہی دراصل ان کے رخِ اسود کے لیے رخ نما کا کام دیتے تھے۔ بقول شخصے آپ عمر بھر ''مسکراتے رہو کہ نظر آتے رہو'' پر عمل پیرا رہے۔

اِس رسالے میں آپ کو فارسی اور عربی کا سلسلہ ہائے ترکیب مہمل یا بے محل نظر آئے تو یہ استادِ مرحوم کی صحبت اور محبت کا فیضان ہے، ورنہ ناچیز تو ذات اور کام دونوں کا دھنیا ہے۔ استادِ محترم کے جنت مکانی خلد آشیانی ہونے کے بعد بھی، بلکہ خود اپنے جنت مکانی ہونے تک یہ عاجز خود کو استاد محترم کا مقروض و مرہونِ منت سمجھتا رہا ہے اور سمجھتا رہے گا اور یہ جو تین حرف اس عاصی نے ضبطِ حیطہ تحریر کیے ہیں تو ان کا مقصد مورخین اِمروز و فردا کو حقائق باہم پہنچانا ہے تا کہ مورخین خوش مذاق تاریخ کا قبلہ درست رکھ سکیں۔ ان جملہ ہائے غیر معترضہ کو رقم کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سانس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ گیا سانس واپس آئے نہ آئے۔ اس خیال سے کہ یہی سانس غنیمت ہے۔ استادِ مرحوم و مغفور کے بارے چند در تحسین و آفرین حوالۂ صفحۂ قرطاس کر دیئے ہیں ورنہ آپ کی سوانح عمری جس کو سانحاتِ عمری کہنا زیادہ مناسب ہوگا کے لیے دفتر کے دفتر ناکافی ہوں۔ انشاءاللہ پھر کبھی فرصت ملی اور ڈوری سانس کی نہ ٹوٹی تو ذرا تفصیل کے ساتھ استاد محترم کے بارے میں لکھا جائے گا۔

اوریانہ فلاشی/خالد سعید **(قسط سوم)**

ایک مرد

یہ حقیقتاً ایک حفاظتی کارواں تھا۔ اس کی رہنمائی موٹر سائیکل سوار دستہ کر رہا تھا۔ تین فوجی دائیں اور تین ہی بائیں جانب۔ اس کے پیچھے کاروں پر مشتمل حفاظتی دستہ تھا، جس میں دو جیپیں ایک قطار میں تھیں، پھر ریڈیو کار، اُس کے بعد پھر چار موٹر سائیکل سوار فوجی اور آخر میں یہ سیاہ لنکن کار۔ اُس کے بعد ایک اور جیپ تھی اور موٹر سائیکل سواروں کا ایک اور دستہ۔ یہ کارواں سیدھی سڑک کے آخری موڑ سے گزرا اور معمول کی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت جلد یہ ایک اور موڑ کے پیچھے نظروں سے غائب ہو جائے گا اور پھر اِس جا سے گزرتے ہوئے جہاں تم کھڑے ہو یہ دوبارہ ظاہر ہوگا۔ موٹر سائیکلوں اور موٹروں کے انجنوں کا پاگل شور بڑھتا گیا اور تم نے ایک سارس کے مانند اپنی گردن گھمائی تا کہ اسے بہتر طور پر نظر میں رکھ سکو۔ پہلے دو موٹر سائیکل سوار تمہاری جانب آگے بڑھتے ہوئے نمودار ہوئے، وہ اس قدر واضح اور صاف دکھائی دے رہے تھے کہ تم بآسانی اُن کے خدوخال کی شناخت کر سکتے تھے۔ لیکن بل بورڈ (تختے پر لگا ہوا اگلا حصہ) کے قریب پہنچتے پہنچتے وہ اک دوجے میں گڈمڈ سائے سے بن گئے اور یہ امر تم پر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ لوگوں اور چیزوں کے درمیان اس سے زیادہ فرق کرنا تمہارے لیے ممکن نہ ہوگا۔ اور عمل ہاں عمل کے لیے تمہیں کلیتاً اپنے وجدان پر ہی انحصار کرنا پڑے گا، وقت کے اپنے تخمینوں اور اِس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ بل بورڈ اور پہلی بارودی سرنگ کے درمیان اَسی (۸۰) میٹر فاصلہ ہے، تم نے سوچا، اَسی میٹر کا یہ سفر سو (۱۰۰) کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تقریباً تین (۳) سیکنڈ میں طے ہوگا۔ اندازاً! اندازاً تمہارا دماغ ایک وحشیانہ تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا اور اعصاب میں شدید تناؤ سے تمہارا پورا جسم اپنی لچک کھو بیٹھا تھا۔ عذاب۔۔۔ یہ سارا عذاب اس ایک لفظ ''اندازاً'' میں تھا۔ اگر ستائیس (۲۷) میٹر کا فاصلہ ایک سیکنڈ میں طے ہو، تو پھر تین سیکنڈ کا مطلب اکیاسی (۸۱) میٹر ہے، نہ کہ اَسی (۸۰) میٹر۔ لہٰذا پہلی بارودی سرنگ ذرا تاخیر سے پھٹے گی۔ دوسری بارودی سرنگ پہلی سے ایک میٹر کے فاصلے پر ہے لہٰذا بہت جلد دوسرا دھماکہ بھی ہو جائے گا مگر یہ حساب کے مطابق اَسی (۸۰) میٹر کی بجائے اکیاسی (۸۱) میٹر کا فاصلہ۔ اس کا کیا کیا جائے؟ ہاں بارودی سرنگوں کو اُڑانے کے عمل میں تاخیر کرنا ہوگی۔ مگر کتنی تاخیر؟ ویسے تو یہ سادہ سی بات ہے۔ اگر ایک سیکنڈ کے دسویں حصہ میں دو میٹر ستر (۷۰) سینٹی میٹر کا فاصلہ طے ہوتا ہے تو اسے اندازاً ایک سیکنڈ کے دسویں حصہ کے تیسرے حصے تک ملتوی کر دیا جائے۔ اندازاً۔۔۔ یہ بدبخت ''اندازاً'' پھر آن ٹپکا! اور علاوہ ازیں اس کے ہمیں یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ سیاہ لنکن اپنی معمول کی رفتار برقرار رکھے گی! اور قسم عیسیٰ مسیح کی، یہ ایک سیکنڈ کے دسویں حصہ کا تیسرا حصہ کتنی دیر رہے گا؟ پلک

جھپکنے کا عرصہ؟ نہیں اس سے بھی کہیں کم۔ آج کے دن ایک سیکنڈ کے دسویں حصہ کا تیسرا حصہ ہی ہمارا لیکھ ہے۔ تمہیں چاہیے کہ خود کو تقدیر پر چھوڑ کر کوئی وقت ضائع کیے بغیر اپنا کام کرو ''جو ہوگا دیکھا جائے گا'' بہت آہستگی سے گنو'' کلیا اینا(Kilia Ena) کلیا ڈیو(Kilia Dio) کلیا ٹرائیا(Kilia Tria) ایک ہزار اور ایک، ایک ہزار اور دو، ایک ہزار اور تین۔'' اور دھیرے لیکن اور ''دھیرے'' کا کیا مطلب ہے؟ یہ کہ تب تک دو جیپیں گزر چکی ہیں۔ ایمبولینس گاڑی بھی گزر چکی ہے۔ ریڈیو کار اور موٹر سائیکل سوار بھی گزر چکے ہیں۔ اب اس کی آمد آمد ہے۔ یہ وہ آئی۔۔۔۔ ہاں یہ سیاہ لنکن۔۔۔۔ بالکل آ رہی ہے۔ یہ اور قریب آئی، کالی چمکتی ہوئی لنکن۔ اس کا حجم مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ سیاہ سے سیاہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک پل کے اندر یہ بل بورڈ کے نزدیک پہنچ جائے گی۔ محض سایۂ موہوم۔ اُمید یہ کرنی چاہیے کہ سیاہ لنکن کار کی رفتار نہ تو بڑھے گی اور نہ ہی کم ہوگی۔ یہ اب معینہ مقام تک پہنچنے ہی والی ہے۔ لو یہ اب پہنچی۔ یہ پہنچ گئی۔ ایک ہزار ایک، ایک ہزار دو، ایک ہزار تین۔ اُڑا دو! مگر اُس ایک دائم لمحہ میں کچھ بھی تو نہ ہوا۔ پھر تم نے کانوں کے پردے پھاڑنے والا ایک مہیب دھماکہ سنا۔ بہت سے پتھر دُور دُور تک فضا میں اُڑے۔ دفعتاً گرد کا ایک خاکستری بادل چھایا۔ محض ایک بادل۔۔۔ او خدا، صرف ایک بارودی سرنگ پھٹی تھی۔ کیا تمہارے وہم و گمان میں یہ آ سکتا تھا؟ کہ اتنے دھماکے کے باوجود تم سے ایک سنگریزہ تک نہ ٹکرایا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا؟ تم نے ایک بے یقینی کے عالم میں اپنے بدن کو ٹٹولا۔ لیکن تمہارے پاس بلاشبہ اتنا وقت نہ تھا کہ خود کو صحیح سلامت بچنے پر مبارک باد دے سکتے، کیونکہ ایک ہی پل میں تم پر یہ انکشاف ہو چکا تھا کہ تم اپنے مشن میں ناکامی کے کارن محفوظ و مامون رہے تھے۔ اگر تم کامیاب ہوئے ہوتے تو ایک اسلحہ سے بھری ہوئی گاڑی کے پھٹنے کے دھماکے سے بڑا دھماکہ ہوتا، زیادہ گہرا دھوئیں کا بادل اُٹھتا اور پتھر محض فضا میں ہی نہ اُڑتے بلکہ ہر شے تہس نہس ہو جاتی پھر کس شے میں کمی رہی، بارود بھرنے کے عمل میں، وقت کے تعین میں، کلیا اینا (Kilia Ena) کلیا ڈیو(Kilia Dio) اور کلیا ٹرائیا(Kilia Tria) کے گنتی کے نظام میں۔ کیا مقدر میں یہی لکھا تھا؟ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کا تیسرا حصہ۔۔۔ ہائے مقدر، لیکن دوسری بارودی سرنگ کیوں نہ پھٹی؟ کیا تم نے اس میں بھدے طریقے سے بارود بھرا تھا؟ کیا تم تاروں کو پھٹنے والے مواد کے ساتھ موزوں طریقے سے جوڑنے میں ناکام رہے تھے؟ یا پھر یہ چینی کی وجہ سے تھا۔ چینی کے بارے میں ایک دل لگی ___ کیا یہ کافی میٹھا ہے۔ کیا اس میں بھرا ہوا چائے کا چمچ اور نہ ڈال دیں؟ تم نے ایک لاشعوری انداز میں راہ فرار اختیار کرتے ہوئے خود سے یہ سارے سوالات کر ڈالے۔ تم نے ایک یقینی انداز میں اپنے جسم کو چھونے کے بعد پشتے سے نیچے چھلانگ لگائی اور اب تم بھاگ رہے تھے۔ تم صرف ایک واحد تحریک کے زیر مسلسل بھاگ رہے تھے کہ کسی طور سمندر تک پہنچو اور اُس میں غوطہ لگا کر پانی میں گم ہو جاؤ، جیو میرے شیر جیو! یکایک سمندر تمہارے قدموں میں تھا اور تمہارے جسم کو چاروں اور یخ پانی نے گھیر لیا تھا اور عین اُس وقت تمہارے ذہن نے گواہی دی کہ پانی واقعتاً برف کی مانند یخ تھا اور ایک خاص مقام پر تو وہ

اس قدر سرد تھا کہ تمہیں سانس لینے کے لیے پانی کی سطح سے اوپر آنا پڑا اور تمہیں سڑک پر ایک نگاہ ڈال کر جائزہ لینے کا موقع مہیا کیا۔ وہاں پولیس اپنے ہاتھوں میں ریوالور لیے بھاگ رہی تھی اور جتنا کچھ تم دیکھ سکے اس سے تمہیں شدید خطرے کا احساس ہوا۔ فوراً ہی تم نے اپنے پھیپھڑوں میں ہوا کو بھرا اور پھر نیچے گہرے پانی میں غوطہ لگا دیا۔ ایک بار پھر تم گہرے پانیوں میں تیر رہے تھے۔ تم پوری قوت اور قریب قریب اتنے ہی اعتماد سے تیرے، تم ہمیشہ سے ہی ایک عمدہ اور ماہر پیراک رہے ہو۔ لیکن ساگر تمہارے گمان سے کہیں زیادہ غضبناک تھا۔ ایک بے حد تیز و تند موج تمہیں کشتی کی بجائے ساحل کی جانب دھکیل رہی تھی، تم سانس لینے کی خاطر ایک بار پھر سطحِ آب پر آئے۔ تم نے ایک بار پھر پولیس کی جانب دیکھا۔ یہ جائزہ لینے کے لیے کہ کہیں وہ تمہارا پیچھا تو نہیں کر رہے۔ مگر نہیں، وہ تو سارے کے سارے اُس زمین دوز بدرو کے نیچے واقع اُس چھوٹی غار کے طرف دوڑ لگا رہے تھے۔ اُنہوں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا اور تم پوری دلجمعی اور اطمینان سے اپنا کام جاری رکھ سکتے تھے۔ مگر موج آب بہت تند و تیز تھی۔ ایک بار پھر سخت محنت سے تمہارا سانس ختم ہوا اور ہر تھوڑی دیر کے بعد تمہیں رُک کر دوبارہ سانس لینا پڑتا اور اس سے بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو رہا تھا۔ ان موجوں میں کیا شکتی تھی! اور تم اپنے اندر بہت دُور تک انہیں محسوس کر رہے تھے بالآخر ایک طیش مند موج نے تمہیں ایک چٹان پر لا پٹخا اور تم نتائج و عواقب سے بے پرواہ مگر ساتھ ہی ساتھ تلملاتے ہوئے چٹان کے ایک آگے نکلے ہوئے سرے سے چمٹ گئے۔ اُس لمحے کے نتائج، جن کی پیش بینی نہ کی گئی تھی، اب تم پر روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ عین اُسی پل تمہاری مضطرب نگاہیں موٹر بوٹ کو تلاش کر رہی تھیں۔ تم نے انہیں پورے پانچ منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ کسی بھی صورت ایک سیکنڈ بھی زائد نہیں۔ تم نے انتہائی بے رحم کٹھور انداز میں اُن پر واضح کر دیا تھا تا کہ اُن کی سمجھ میں یہ بات آ جائے ’’کہ یہ ایک حکم ہے!‘‘ اب جب کہ پانچ منٹ گزر چکے تھے۔ تو وہ یقیناً حکم کی تعمیل میں یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ بس اب یہاں سے نکلو اور اُس تنگ گھاٹی کی جانب چلو جہاں موٹر بوٹ میں موجود ساتھی تمہارے منتظر ہیں۔ تم نے درد کی ایک تیز لہر کے ساتھ خود کو پانی میں سے نکالا اور سخت کانٹوں کی مانند نوکیلی چٹانوں کے اوپر سے دوہرا ہو کر دوڑنا شروع کیا۔ ہر قدم ایک زخم، ایک تیز ٹیس۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تم اپنی منزل سے قریب تر ہو رہے تھے۔ بس اور پچاس، تیس میٹر کی بات اور پھر تم انہیں آواز دے کر بلا سکو گے۔ ’’میں یہاں ہوں! میں آ رہا ہوں، میرا انتظار کرو، میں بس آیا کہ آیا!‘‘ یکا یک موٹر بوٹ میں حرکت ہوئی، اُس کا سامنے والا حصہ سمندر کی جانب تھا اور وہ سمندر کے تلملاتے پانیوں پر دُور سے دُور تر ہوتی چلی گئی۔

وہ چلی گئی اور تم اپنا باقی جیون اس آسیبی یاد کے ساتھ بھگتتے رہو گے کہ تمہاری اس پکار کے باوجود کہ ’’میں آ رہا ہوں، ٹھہرو میں آیا کہ آیا‘‘ اُنہوں نے تمہارا مزید انتظار نہ کیا اور وہ چلے گئے۔ اُس پل ایک ہولناک اندھے خلا کے احساس نے تمہیں اپنے اندرون سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ تمہارے اندر نالہ و فریاد

اور پھر چلانے کی پُر زور خواہش پیدا ہوئی۔ بزدلو، حرامیو، نامردو! ایک اتھاہ مایوسی اور نامرادی۔ مگر سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے، ’’میں اب کر بھی کیا سکتا ہوں؟‘‘ تم نے اپنی نگاہیں سڑک کی جانب کیں جہاں اب تک پولیس نے اپنی عارضی چوکی بنا لی تھی اور وردی پوش ایک ہیجاناتی کیفیت میں چلا رہے تھے۔ ’’ساحل پر نگاہ رکھو! ہر حرکت کرنے والی شے پر نظر رکھو!‘‘ اب کیا کیا جائے؟ چھپ جانا چاہیے۔ بے شک، خود کو چھپا لو۔ لیکن کہاں؟ تمہاری آنکھیں ایک عالم تحیر میں کسی کھوہ یا غور کو تلاشتی رہیں۔ ایک ایسا خلا، جہاں تم پناہ لے سکو۔ یہاں! یہ چھوٹی سی غار، ایک قسم کے طاقچے جو ساحل پر چٹانوں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ ایک شاید زیادہ ہی تنگ سہی، ہاں، لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ تم وہاں اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پر گھسٹتے ہوئے وہاں پہنچے۔ تم نے اپنے آپ کو اندر سے سکیڑا، جیسے ایک سیپی میں گھونگھا کرتا ہے یا پھر رحم مادر میں کچا بچہ، تمہارا ماتھا، تمہارے گھٹنوں سے لگا ہوا اور تمہارے بازو تمہاری ٹانگوں سے لپٹے ہوئے اور تم اُس تنگ کھوہ میں گھس گئے۔ تمہیں شاید یہاں رات گئے تک رُکنا ہوگا۔ تاریکی گہری ہونے پر وہ اپنی تلاش ملتوی کر دیں گے اور اگر خوش بختی تمہارا ساتھ دے تو تم یہاں سے نکل کر سڑک پر آ جاؤ گے۔ یہ امر تو خیر عین فطری ہے کہ تمہیں یہاں بہت سے گھمبیر مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مثلاً پہلی بات تو یہ کہ اتنی رات گئے ننگے پاؤں ننگے بدن باہر گھومنا، پھر یہ کہ تم نے مختلف مقامات پر اپنے چھپے ہوئے ساتھیوں کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ ہنگامی صورت میں تمہیں وہاں سے لے سکیں اور۔۔۔ لیکن جب تم اُن سے ملو گے تو انہیں کیا جواب دو گے؟ اُن کے سوالات کا سامنا کیسے کرو گے؟ اُن کی خاموش ملامتیں اور طعنے؟ کہ تاروں میں گنجل پڑنے کی وجہ سے تار چھوٹی ہوگئی اور سب کچھ غلط ہو گیا۔ یا ایک مایوسی کے عالم اور انتہائی جلدی میں کیے گئے تخمینے غلط ثابت ہوئے۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کے تیسرے حصہ کا گھپلا، یا پھر یہ سب مقدر کا کھیل تھا؟ تم پر اب یہ امر واقعہ واضح تھا کہ تم نے وہاں گنتی کرتے ہوئے زیادہ وقت لیا تھا۔ تم نے کلیا اینا (Kilia Ena) کلیا ڈیو (Kilia Dio) اور کلیا ٹرائیا (Kilia Tria) کو زیادہ سست رفتاری سے گنا تھا۔ پہلی بارودی سرنگ میں اُس وقت دھماکہ ہوا، جب سیاہ لنکن کار زمین دوز بدرو سے تین میٹر آگے گزر چکی تھی اور دوسری بارودی سرنگ؟ تم اس امر واقعہ کا کیا جواز گھڑو گے کہ دوسری بارودی سرنگ میں کوئی دھماکہ نہ ہوا تھا؟ اوہ، تھیاس (Theos)! تھیاس مؤ (Theos Mou)! خدا، اے میرے خدا! یہ سارا کار، یہ سب رنج و مصائب، تمام قربانیاں، مہینوں کی کٹھنائیاں، سب رائیگاں گئیں۔ ضیاع مطلق۔ افسوس، صد افسوس! لیکن تمہیں اس کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ وگرنہ تم یہ سب کچھ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤ گے۔ اس وقت ذہنی صحت برقرار رکھنے کا یہی نسخہ کیمیا ہے کہ اپنا دھیان کسی اور شے کی جانب کر لو۔ وہ علامتی دھماکے کیا ہوئے، پہاڑوں پر آگ۔ جب تم نے آمر کی ہلاکت کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا تو علامتی طور پر سٹیڈیم اور پارک میں دھماکے ہونے تھے۔ پھر پہاڑوں پر درختوں نے آگ پکڑنی تھی اور آگ و شعلوں کے اِس ایک ہار نے شہر کو خواب غفلت سے جگانا تھا۔

سمندری بگلا، سمندری بگلا! تمہاری ہدایات تو بے حد مختصر اور جامع تھیں لیکن کیا دوسروں نے اس پر عمل درآمد کیا؟ کیا حضرت عیسیٰ کے حواری کم پڑے تھے، جو تم تن تنہا فوجی آمریت کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتے تھے۔ اگر تم ناکام ہوئے ہو تو شاید اُن کے مقدر میں بھی کاتبِ تقدیر نے نامرادی ہی لکھی تھی۔ سٹیڈیم میں کوئی دھما کہ ہوا نہ پارک میں۔ پہاڑوں میں کسی شے نے آگ نہ پکڑی۔ نہ پہلے اور نہ ہی بعد میں۔ جارجینز اس موقع پر کیا کہتا ہوگا؟ اور پیشہ ور سیاستدان، جو اپنی بات چیت اور وعدوں پر کبھی پورا نہ اُترے؟ یقیناً وہ اپنی پیش بینی کی حیرت انگیز صلاحیتوں کو دل کی پوری گہرائیوں سے خود کو سراہ رہے ہوں گے۔ ''وہ اکیلا احمق، بے باک اور گستاخ باغی، جس کے وچاروں میں وہ بزعم خود منظّم پارٹیوں، نظم وضبط اور نظریات کی منطق کی جگہ پُر کرسکتا ہے۔ ہمیں تو پہلے ہی پتہ تھا کہ ایسے غیر ذمہ دار اور بے ہودہ شخص کو سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔ اب سے اِس طرح کی کوئی اور خرافات نہیں چلے گی۔'' اب تو صرف ایک ہی کار باقی تھا کہ کسی طور یہاں سے بھاگ لو۔ اس طرح سکڑے سمٹے ہوئے، اپنے جوڑوں میں درد اور چبھن کو برداشت کرنا اور اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو پھیلانے کی خواہش کو روکنا، کس قدر اذیت ناک ہے اور یہ تمہارے اندر کیسا اندھیرا چھا رہا ہے؟ جاگتے رہو اور کسی طور اس کا مقابلہ کرو۔ مگر اس ہیلی کاپٹر کے ساتھ جو نیچی پرواز کر رہا ہے کیا کوشش کی جا سکتی ہے؟ یہ تمہارے اوپر سے اور تمہارے آگے اور پیچھے گزر رہا ہے اور اس کے پروں کی آواز تمہیں ایک لوری کی مانند سکون آور محسوس ہو رہی ہے۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے جیسے ایک سیسے کا پردہ سا لہرا گیا ہو۔

تم کتنی دیر عالم خواب میں رہے؟ تمہیں گھڑی بہرحال کوئی اطلاع نہ دے سکتی تھی کیونکہ پانی میں بھیگنے کے بعد یہ کام نہ کر رہی تھی۔ اسے رُکے ہوئے کتنا وقت ہوگیا تھا شاید ایک گھنٹہ یا دو گھنٹے پہلے۔۔۔ تمہیں صحیح اندازہ نہ ہوسکتا تھا لیکن سورج اب اوپر آ گیا تھا اور اپنی کھوہ کی درز میں سے تم اسے ابھرتا ہوا دیکھ سکتے تھے۔ اب تمہیں اتنی سردی بھی نہ لگ رہی تھی بلکہ تم اپنے پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔ تم نے کچھ آوازیں سُنی اور تمہاری آنکھ کھل گئی۔ یہ آوازیں بہت قریب تھیں، اتنی قریب کہ تم پوری وضاحت سے یہ امتیاز کرسکتے تھے کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ ''اس علاقے میں ہر ہر چٹان پر اُسے تلاش کرو!'' یکا یک ہیلی کاپٹر اپنی منحوس اور نامیسعود آواز میں غل غپاڑہ کرتے ہوئے واپس آ گیا تھا۔ تمہیں یوں محسوس ہوا، جیسے ایک بھاری مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ جاری ہو۔ ایسے لگ رہا تھا کہ پوری یونانی فوج آپریشن کے لیے متحرک ہوگئی ہو۔ ''ایک دستہ یہاں نیچے بھیجو!'' ''سارجنٹ، آؤ، یہاں تمہاری ضرورت ہے!'' ''ایک لائن میں نہ آؤ، بلکہ ہر جانب پھیل جاؤ!'' تمہیں ایک مغرور، گھمنڈی اور غصیلی چلاہٹ سنائی دی اور تمہیں یوں لگا جیسے تمہاری کنپٹی پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔ یہاں کے چپے چپے کی تلاشی لو، یہ میرا حکم ہے!'' ''جی سر کیپٹن'' اور تمہارے سر کے اوپر غار کی چھت میں درز میں سے تم آسمان دیکھ رہے تھے، کو جوتوں کے ایک جوڑے نے ڈھانپ لیا تھا۔ تم نے اپنا سانس روک لیا تھا۔ تم نے ایک یاسیانہ بے جگری

کے عالم میں خود کو اور زیادہ سکیڑا اور سمٹا لیا تھا اور چند لحظوں کے لیے ہی سہی، تمہیں ایسا لگا جیسے تم پھر سے بچہ ہوگئے تھے۔ وہ سمے، جب تمہاری ماں تمہیں سزا دینے کے لیے ڈھونڈا کرتی تھی اور اُس کی مار سے بچنے کی خاطر تم پلنگ کے نیچے چھپ جاتے اور گھبراہٹ اور افراتفری میں تم دیوار کی جانب گھسٹتے جاتے اور وہیں پر ہی اُس کے قدموں پر نگاہیں جمائے تم اُس کی غراہٹ اور بڑبڑاہٹ کو سنا کرتے۔ ''کہاں گیا وہ کم بخت، کدھر چھپ گیا وہ؟'' اور تمہارے بھنچے ہوئے ہونٹ دعا گو ہوتے__ اے عیسیٰ مسیح، مجھ پر اس کی نگاہ نہ پڑنے دینا، خداوندا اُسے یہاں سے لے جاؤ۔ کئی بار وہ تمہاری کھوج میں ناکامی کے بعد وہاں سے رخصت ہوجاتی لیکن تمہیں اپنے نصیبوں پر کوئی اعتماد نہ تھا اور تم بھوک، پیاس اور پیشاب کرنے کی خواہش کے باوجود اُس کے ڈر سے مسلسل پلنگ کے نیچے چھپے رہتے مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ جھک کر نیچے دیکھتی اور تمہیں پا لیتی اور وہ ایک فاتحانہ انداز میں تمہیں پکڑنے کے لیے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیتی۔ ''چلو بدمعاش، نکلو یہاں سے، میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے۔'' لیکن اب وہ پلنگ کے نیچے تمہیں دیکھنے کے لیے نہیں جھکتیں کیونکہ اب تم ایک پورے مرد تھے، اور خوش بخت بھی کہ گزشتہ سولہ مہینوں میں تم درجنوں بار اپنا بچاؤ کرنے میں کامیاب و کامران رہے تھے۔ تم اب اُس آفیسر کے جوتوں کے جوڑے سے کیونکر ہراساں ہوتے جو تمہارے سر کے اوپر موجود معمولی درز کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ ایک کرخت آواز نے چلا کر کہا ''کپتان صاحب، ہم نے یہاں بہت اچھی طرح سے تلاشی لے لی ہے۔ یہاں تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔'' ''ایک نظر اوپر کی جانب دیکھو، پھر دوسری سمت کا جائزہ لیتے ہیں۔'' تم نے ایک گہرا سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں کو پھلایا خوشی سے اپنی بند مٹھیوں کو بھینچا اور خداوند کا شکر ادا کیا کہ یہ بلائے ناگہانی تمہارے سر سے ٹلی اور تمہارا کام بن گیا لیکن عین اُس لمحے جب تم یہ سب کچھ سوچ رہے تھے، کپتان کے جسم میں حرکت ہوئی، وہ لڑکھڑایا اور چٹان سے نیچے آن گرا۔ اب وہ تمہارے روبرو تھا اور یہ تو ظاہر تھا کہ اُس نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔

اپنے کپکپاتے لرزتے ہاتھوں میں ریوالور لیے اور تمہارا نشانہ لیتے ہوئے اُس نے چلا کر کہا ''گولی مت مارنا! گولی نہ چلانا!'' اور تم اسے یہ جواب تک نہ دے سکے کہ آخر تم کس شے سے گولی چلاؤ گے؟ وہ پھر چلایا ''باہر نکلو، باہر آؤ!'' لیکن یہ سب بے کار گیا۔ دراصل غصہ اور خوف سے کہیں زیادہ حیرت نے تمہیں مفلوج کر دیا تھا۔ تم اپنے آپ کو اس گنجھل سے نہ چھڑا سکے۔ تم اپنے کول کو پھاڑ کر اس میں سے باہر نہ آ سکے۔ بہرحال یہ کام اُنہوں نے خود کیا۔ اُنہی مچھلیوں کے وحشیانہ پن سے جنہوں نے تمہارے خواب میں سمندری بگلے پر حملہ کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کرتے ہوئے اور ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے ہوئے وہ تم پر ٹوٹ پڑے اور تمہیں پاؤں سے پکڑ کر کھینچ باہر نکالا اور تمہیں اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہونے پر مجبور کیا۔ اُنہوں نے اس امر کو بے دردی سے نظر انداز کر دیا تھا کہ اپنی ٹانگوں کے عضلات میں کھچاؤ اور اینٹھن کے باعث تم سیدھا کھڑا ہونے سے قاصر تھے اور سمندری بگلے کی مانند اپنا

دفاع کرنے کی کوئی کوشش محض پاگل پن ہوتی۔ وہ تعداد میں اَن گنت تھے اور یوں لگتا تھا کہ وردی پوشوں کا ایک سیل رواں ہے جو مسلسل پھیلتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ تمہیں بُری طرح زدوکوب کر رہے تھے اور تمہیں اس طرح نوچ اور بھنبھوڑ رہے تھے، جیسے تمہارے وجود کو پوری طرح محسوس کرنا چاہتے ہوں۔ ایک وردی پوش فوجی نے دوبار تمہاری کنپٹیوں اور آنکھوں پر ضرب لگائی۔ دوسرے وردی پوش نے اپنے دونوں ہاتھ تمہارے منہ میں ڈال کر اُسے پوری طرح کھول دیا، پھر اُس نے اپنی غلیظ انگلیاں تمہارے منہ میں اندر تک خدا جانے کس شے کی تلاش میں گھسا دیں اور زور سے چلایا ''اوئے تھوکو اے، باہر تھوکو اوئے!'' ایک اور نے تمہاری غسل والے جانگیے کو یہ دیکھنے کے لیے تار تار کر دیا کہ کہیں تم نے اس کے اندر کوئی خطرناک ہتھیار تو نہیں چھپا رکھا۔ پھر انہوں نے تمہارے دونوں ہاتھوں کو تمہارے سر پر رکھا اور تمہیں ایک ڈھلوان سے دھکیلتے ہوئے چلے لیکن اس حالت اور حلیہ میں تم پیدل چلنے کے قابل نہ تھے کہ تمہارے پیروں کے تلوے تو پہلے ہی سے ان نوکیلی چٹانوں پر دوڑ دوڑ کر پھٹ چکے تھے، اور اب ہر پتھر تمہارے لیے ایک تیز دھار خنجر بن چکا تھا، اگر تم ایک لحظہ کے لیے بھی اپنے درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے رُکتے تو وہ تمہیں انتہائی بے صبری کے ساتھ اپنی رائفلوں اور پستولوں کے بٹ سے چوٹ لگاتے۔ سڑک پر پہنچنا تمہارے لیے تسکین کا سامان لایا، مگر فوراً ہی یہ راحت ایک شدید تلخی میں ڈھل گئی۔ وہ مقام جہاں پر تمہارے خیال میں ایک عمیق گڑھا ہونا چاہیے تھا۔ وہاں بمشکل دو میٹر کا ایک ادھورا خلا نظر آ رہا تھا جس سے یہ بات اظہر من الشّمس تھی کہ تم نے سیکنڈ کے دسویں حصے کے تیسرے حصہ میں ہی غلطی نہ کی تھی بلکہ تم سے بارود بھرنے اور پھر اِسے اُڑانے کے عمل میں بھی فاش غلطی سرزد ہوئی تھی۔ اُنہوں نے تمہیں ایک کھلی اور آرام دہ کار میں دھکیلا، اس میں سپرنگ دار نشستیں تھیں۔ کار میں بیٹھتے ہی اُنہوں نے تم سے تفتیش شروع کر دی۔ ''کون ہو تم؟ کس نے تمہیں اس کام کے لیے پیسے دیئے؟ اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بتاؤ؟ موٹر بوٹ میں کون کون سے لوگ موجود تھے؟'' پھر تھپڑوں اور ضربوں کی بارش، پنڈلیوں اور ٹانگوں پر زوردار ٹھوکریں۔ ان میں سب سے خونخوار اور کٹھور سویلین لباس میں ایک بھاری بھرکم شخص تھا، اُس کے خدوخال بندروں ایسے تھے اور اُس کی جلد پر چتے پڑے ہوئے تھے، بڑے بڑے سوراخوں والے زخموں کے نشان، جو چیچک یا کسی اور ایسی ہی متعدی بیماری سے پڑے تھے۔ اس کا ہاتھ بہت بھاری تھا، غالباً کسی باکسر کا ہاتھ اور جتنی خاموشی سے تم اُس کے تشدد کا مقابلہ کرتے، اُسی تناسب سے اُس کی خون کی پیاس بڑھتی جاتی۔ ''بولو، اے ذلیل اجرتی قاتل، بولو! بولو، ورنہ میں تمہارا قیمہ بنا دوں گا۔'' پیشہ ور مجرم، کمینے، مجھے فوراً بتاؤ، مجھے جواب دو، ورنہ مار مار کر تمہاری کھال کھینچ لوں گا۔'' انجان بننے کی اداکاری مت کرو، ذلیل، قاتل، غدار تم اس طرح سے میرے ہاتھوں سے بچ نہ پاؤ گے، اگر تم نے سوالوں کا فوری جواب نہ دیا تو میں تمہیں ہلاک کر دوں گا۔ تمہیں پتہ ہے، میں کون ہوں؟ کیا تمہارے علم میں ہے کہ تمہارا واسطہ کس شخص سے پڑا ہے؟'' امر واقعہ یہ تھا کہ تمہیں ہرگز یہ علم نہ تھا کہ وہ کون ہے اور تمہیں اس کی قطعاً کوئی پرواہ

بھی نہ تھی۔ تمہیں تو صرف ایک شے کی فکر تھی کہ کسی صورت تم اپنی خاموشی اور سکوت کو برقرار رکھنے کے قابل رہ سکو اور انہیں کوئی معمولی سا اشارہ اور کنایہ بھی نہ ملے کہ جس سے وہ تمہاری شناخت کر سکیں۔ اگر انہیں اس وقت تمہارا نام یا پتہ مل گیا تو تمہارے ساتھیوں کو بچ نکلنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ یکایک ایک اور وردی پوش اندر داخل ہوا۔ ایک پکی عمر کا اور بظاہر متحمل اور دھیمے مزاج کا حامل اور اُس نے ماتا دار تفتیشی افسر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے اُس کی جیکٹ کو کھینچا۔ ''بلو میجر، میری بات سنو، سنو تو سہی میجر، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ کون ہے؟ میں اِسے جانتا ہوں اس لیے کہ میں آج کل گلائی فیئر امیں تعینات ہوں، اس کا تعلق بھی گلائی فیڈا اسے ہے اور اس کا نام پانا گاؤلیس (PanaGoulis) ہے اور۔۔۔'' لیکن چیچک کے داغوں کے حامل آدمی نے اُسے اپنی بات مکمل کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ اُس نے اپنا منہ کھولا اور تم پر اپنی غلیظ تھوک کی بارش کرتے ہوئے وہ چلایا۔ اچھا تو یہ تم ہو، اے حقیر کیچوے! سو تم نہ تو غائب ہی ہوئے تھے اور نہ ہی بیرون ملک فرار ہوئے تھے، لیفٹیننٹ جارج پانا گاؤلیس؟ تم یہیں موجود تھے تم غلیظ اور متعفن کیڑے، حرامی، بھگوڑے، غدار تو تم ایتھنز میں ہی تھے۔ بُزدل اور تمہارا خیال تھا کہ تم یہ سب کر کے بچ جاؤ گے؟'' پھر ایک ناقابلِ برداشت جلن، جیسے گردن میں ایک چھرا گھونپ دیا گیا ہو۔ اُس نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ تمہاری گردن پر رکھ دیا تھا۔ تم ایک کراہ کے ساتھ نیچے ڈھلک گئے۔ تمہارا ذہن اتھاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

اپنے جیون کے آخری دنوں میں، جب تم نے مجھے اپنے گرفتار ہونے کی کتھا سنائی تھی، تمہیں واضح طور پر قطعاً یاد نہ تھا کہ جب تمہاری گردن پر سگریٹ رکھا گیا۔ تو اُس کے بعد تم پر کیا گزری۔ تمہاری یاد صرف کچھ منتشر تمثالوں پر مشتمل تھی پراگندہ، بے ترتیب دھجیاں۔ پکی عمر والا فوجی ماتا کے داغوں والے آدمی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ تاکہ اُسے صراحت سے بتا سکے کہ تم جارج نہیں بلکہ اُس کے دوسرے بھائی الیکسینڈر (آلیکاسی) ہو، لیکن تمہاری شناخت پر یقین کرنے کے بعد ماتا کے داغوں والے شخص نے اُسے دھکا دے کر پرے کر دیا۔ وہ اُس کی کوئی بات سننے کا قطعاً روادار نہ تھا اور جب اُس نے مزید وضاحت کی کوشش کی تو اُس نے اُسے اور دھکے دے کر پرے کرتے ہوئے کہا ''دفع ہو جاؤ، احمق، مجھے پریشان نہ کرو۔ اندھے ہو، تمہیں دکھائی نہیں دے رہا کہ میں سرکاری کام کر رہا ہوں!'' پکی عمر والے فوجی نے سر تسلیم خم کیا اور اپنے کندھے اچکاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے علاوہ تمہیں کچھ یاد نہیں۔ اس گاڑی میں مسلسل دو گھنٹے تمہیں کس طرح زدوکوب کیا گیا۔ ہر شے تمہارے حافظہ سے محو ہو چکی ہے۔ بہرحال ایک شے تمہیں بہت اچھی یاد ہے اور وہ آمر پاپادوپاؤلیس کے دائیں ہاتھ وزیر داخلہ لاڈاس (Ladas) کی آمد، وردی پوشوں کی دیوار اُسے اندر لانے کے لیے وا ہوئی۔ اُس کا بڑا سا گول دمکتا ہوا چہرہ تمہارے اوپر جھکا اور اُس نے اپنے چھوٹے چھوٹے نرم اور ملائم ہاتھوں سے تمہارے کندھوں کو قریب قریب محبت اور مہربانی کے ساتھ تھپکایا۔ اُس کی ارذل اور خوشامدی باریک آواز تم پر ٹپکی: ''پیارے

لیفٹیننٹ، میری بات دھیان سے سنو۔ میں تمہارے بھائی الیکسینڈر کو جانتا ہوں، میں اُسے اُن دنوں سے جانتا ہوں جب وہ پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ میں میرے بیٹے کا ہم جماعت تھا۔ بلاشبہ وہ ایک مشکل اور ٹیڑھا نوجوان تھا۔ ایک اپنی ہی طرز کا انارکسٹ۔ وہ کریملن پر کڑی تنقید کرتا تھا اور شاہی خاندان بھی اُس کی حقارت کا نشانہ تھا۔ نہ تو اُسے اشتمالیت پسند تھی اور نہ ہی فسطائیت۔ دراصل اسے کوئی شے خوش نہ آتی تھی لیکن اس سب کے باوجود وہ ایک ذہین نوجوان تھا اور اگر تم اُسے صحیح طریقے سے ہینڈل کرسکو۔ تو وہ اپنا ذہن بھی استعمال کرنے کے قابل تھا۔ لیفٹیننٹ، میری بات سن رہے ہو، میں تمہیں یہ سب کچھ اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر الیکسینڈر یہاں موجود ہوتا تو وہ تم سے ضرور کہتا ''بھائی لاڈاس کو سب کچھ بتا دو، اُس پر پورا بھروسہ کرو، اُس کے روبرو اس بات کا اعتراف کرلو کہ اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور یوں تم بہت سی مصیبتوں، ابتلاؤں اور عذابوں سے بچ جاؤ گے۔''

یہ سب کچھ تمہاری لوحِ حافظہ پر اس لیے ثبت ہے کہ جب لاڈاس(Ladas) بات کر رہا تھا تو تمہارا جی بھر آیا تھا۔ بے تحاشہ رونے کی خواہش۔۔۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تمہیں خیال آیا کہ تمہارے اندر رونے اور گریہ کرنے کی اس خواہش کو پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ امر واقعہ کہ وہ غلطی سے تمہیں جارج سمجھ رہے تھے تمہارے لیے ایک بہتر صورتحال تھی، تمہیں بآسانی چند دن یا کم از کم کچھ گھنٹے مل سکتے تھے اور اس سے تمہارے ساتھیوں کو یہاں سے فرار ہو کر کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کا مناسب وقت مل سکتا تھا لیکن جتنا زیادہ تم خود کو قائل کرتے کہ یہ غلط فہمی تمہارے لیے سودمند ہے اتنا ہی زیادہ تمہارا گلا اور رُندھ جاتا اور تمہاری آنکھوں میں کہیں زیادہ نمی آ جاتی۔ ''جارج، تمہیں اس فوج سے لازماً بھاگ جانا چاہیے'' ''لیکن آلیکاس میرے بھائی، میں ایک پیشہ ور فوجی ہوں۔ میں کیسے بھگوڑا ہوسکتا ہوں، یہ کام میرے بس میں نہیں۔۔۔'' ''جارج، تم ایسا کرنے کے اہل ہو، اور تمہیں لازماً اس پر عمل کرنا چاہیے۔ بلاشبہ تم یہ کر سکتے ہو۔'' ''آلیکاس، میرے بھائی، مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا، خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، میں یہ نہیں کرسکتا۔'' لیکن بالآخر تم نے اُسے یقین دلایا کہ تم اس کام کے لیے سارا بندوبست کر دو گے۔ تم نے اُسے پوری طرح قائل کرلیا اور وہ فوجی بھگوڑا ہوگیا۔ دریائے ایوراس(Evros) کو پار کر کے وہ ترکی میں داخل ہوا۔ ترکی سے لبنان اور وہاں سے اسرائیل جا پہنچا۔ لیکن اُسے کوئی ملک پناہ دینے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ کسی دیس نے اُس کی کوئی مدد نہ کی۔ پھر حیفہ کی بندرگاہ میں جب وہ اٹلی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہونے ہی والا تھا تو اسرائیلی پولیس نے اُسے گرفتار کرلیا۔ اُنہوں نے اُسے یونانی بحری جہاز کے ایک کپتان کے حوالے کر دیا۔ یہ جہاز اُسے لے کر واپس یونان آ رہا تھا تاکہ اُسے فوجی جنتا کے حوالے کیا جا سکے۔ جہاز کے کپتان نے حفاظتی تدبیر کے طور پر اسے کیبن میں مقفل رکھا ہوا تھا۔۔۔ ماتا کے داغوں والے شخص کا بیان تھا ''وہ غائب ہوگیا تھا'' کیونکہ جب جہاز پیروس(Piraeus) کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور پولیس اُسے وہاں اپنی تحویل میں لینے کے لیے پہنچی تو اُن کے بیان کے مطابق جہاز کا کیبن خالی تھا اور اُس کے

دروازے میں ایک بڑا گول سوراخ دکھائی دے رہا تھا لیکن تمہیں اس بات کا پورا علم تھا کہ جارج غائب نہ ہوا تھا۔ دراصل وہ مر چکا تھا اور تمہیں اس بات کا پتہ اپنے ایک خواب سے چلا۔ اُس رات جب وہ جہاز حیفہ اور پیروس(Piraeus) کے درمیان سفر کر رہا تھا تم نے ایک خواب دیکھا۔ تم جارج کے ہمراہ ایک پہاڑی راستے پر چل رہے ہو۔ یہ راستہ پہاڑی چٹان کے عمودی آگے کو نکلے ہوئے حصہ پر واقع ہے، جو نیچے سمندر کی جانب جھکا ہوا ہے۔ یکا یک پورا پہاڑ لرز اُٹھا اور جارج ایک تیزی اور تندی میں پھسلتے ہوئے ایک برفانی تودے کی زد میں آ گیا۔ ''جارج'' تم اسے اپنے ہاتھ کا سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے چلاتے پھرے۔ لیکن تم اُسے اپنی گرفت میں نہ لا سکے اور تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے جارج آدم خور مچھلیوں کے درمیان سمندر میں جا پڑا۔

غزلیات

جعفر شیرازی

کوئی مجھ پہ اس کا سخن اثر نہیں کر رہا
غم دوست کیا میرا چارہ گر نہیں کر رہا

میرے آنسوؤں کو کوئی عظیم سا نام دو
میں سمندروں کو ابھی خبر نہیں کر رہا

ہے یہی بہت مری زندگی میری حد میں ہے
کوئی اور کام میرا ہنر نہیں کر رہا

ابھی اشک آنکھوں میں رکھ لیے ہیں سنبھال کر
کہ میں اپنی سمت ابھی سفر نہیں کر رہا

تیرے رنج تیری محبتیں میرے پاس ہیں
میں امانتوں کو اِدھر اُدھر نہیں کر رہا

تیرا دھیان آنکھوں میں بند کر کے پڑا ہوں میں
ابھی جان بوجھ کے میں سحر نہیں کر رہا

مجھے دوسروں کا خیال کیسے رہے کہ میں
ابھی اپنے ساتھ گزر بسر نہیں کر رہا

جو مراسم اس کے ہیں عرصے سے مرے دل میں ہیں
یہ میں جعفرؔ اُس سے گلہ مگر نہیں کر رہا

جعفر شیرازی

کوئی برباد ہوا ہے کوئی رُسوا ہوا ہے
کیا بتائیں تمہیں اس شہر میں کیا کیا ہوا ہے

سامنے آئے تو پہچان لیا ہے تم کو
میں نے پہلے تمہیں اک خواب میں دیکھا ہوا ہے

اتنا خالی بھی نہ سمجھو میری خشک آنکھوں کو
کیا بتائیں تمہیں یہ ابر تو برسا ہوا ہے

اب اگر تم ہو حکایت تو فسانہ میں ہوں
تم ملے تھے، مجھے اس شہر میں عرصہ ہوا ہے

تو نہ شیریں نہ میں فرہاد مگر یہ تو بتا
گو بہ گو دہر میں کس بات کا چرچا ہوا ہے

مجھ سے رسوائی کی یہ تیز ہوا کہتی ہے
کس لیے تم نے دیا طاق پہ رکھا ہوا ہے

میں فقط دھیان میں لے آیا ہوں جعفرؔ اور وہ
بن کے خوشبو میرے اطراف میں پھیلا ہوا ہے

غزلیات

فہیم شناس کاظمی

ہم سفر پہ جب اعتبار نہ ہو
ایسے بچھڑیں کہ دل پہ بار نہ ہو

ورنہ تُو بھی نہ جیت پائے گا
اس طرح کھیل مجھ کو ہار نہ ہو

نا اُمیدی ہے دیدنی اُس کی
جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو

راستوں میں جو اُڑتا پھرتا ہے
وہ کہیں اپنا ہی غبار نہ ہو

ابھی آغاز ہے محبت کا
یہ سمندر بھی بے کنار نہ ہو

نہ رہے فرق مرگ و ہستی میں
زیست سے اس طرح فرار نہ ہو

گھر ہوں گلستاں ہوں ہر جانب
اس زمیں پر کہیں حصار نہ ہو

عشق وہ نشّہ ہے فہیم شناسؔ
ختم جس کا کبھی خمار نہ ہو

فہیم شناس کاظمی

منتظر اس کے شامِ وعدہ رہے
اور تا دیر سر نہادہ رہے

کوئی دیکھے ہماری حالتِ دل
ان کے الفاظ کتنے سادہ رہے

ہم سے بھی رسمِ قیس چھوٹ نہ سکی
درد بھی پیش پافتادہ رہے

سرو سے اور ہجر کی شب سے
اس کی خوش قامتی زیادہ رہے

چاند کب میری دسترس میں تھا
مرے بازو مگر کشادہ رہے

ہر گھڑی جستجوئے رزق رہی
ہم کہاں غرقِ جام و بادہ رہے

پشت پہ تیر کیسے کھائے شناسؔ
اور پھر کیسے ایستادہ رہے

غزلیات

عطاءالرحمٰن قاضی

دشت در دشت جو ہے آج بھی طغیانی میں
ڈوب جاؤں گا کسی روز اسی پانی میں

کوچۂ فکر و نظر سے کہیں باہر نکلیں
کیا عجب راز کھلے عرصۂ نادانی میں

اور پھر بار بدِ غم نے وہ نغمہ چھیڑا
کچھ ستارے چمک اُٹھے دلِ ویرانی میں

توڑ دے قیدِ مکاں، قیدِ زماں، قیدِ حیات
اتنی قوت تو ابھی ہے ترے زندانی میں

محو ہوں آج بھی میں تیری تمنا میں عطاؔ
غرق ہے آج بھی دل عالمِ حیرانی میں

عطاءالرحمٰن قاضی

اپنی آنکھوں میں کسی خواب کا ملبہ لے کر
گھر سے نکلا ہوں مگر ایک تماشا لے کر

بسکہ بے نام زمانوں کا طلب گار ہے دل
کیا کروں گا میں تری یاد کا لمحہ لے کر

روز جاتا ہوں کسی ابرِ گہر بار کے پاس
روز آتا ہوں کسی درد کا دریا لے کر

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دیوانے ترے
آگ میں کود پڑے نام خدا کا لے کر

کب سے جولاں گہہ تقدیر میں رقصاں ہوں عطاؔ
نارسائی میں بھی اک ذوقِ تمنا لے کر

غزلیات

نعیم ساگر

مفاہمت جو ہواؤں سے کر گئے تو گئے
چراغ اب کے اندھیرے سے ڈر گئے تو گئے

ہم اپنی آنکھوں کو اشکوں سے دور رکھیں گے
یہ آبگینے جو اِک بار بھر گئے تو گئے

ہمارے شہر کے پہلو میں ایک جنگل ہے
یہ کھیلتے ہوئے بچے اُدھر گئے تو گئے

یہاں بہت ہی غضب کی ہوائیں چلتی ہیں
گزرنے والے ذرا بھی ٹھہر گئے تو گئے

عجب طرح کا ہے آسیب پانیوں میں نعیمؔ
پرندے جھیل کنارے اگر گئے تو گئے

عاصم احمد

اب ستاروں سے پرے کا ہکشاں ڈھونڈتی ہے
زیست بھٹکی ہے تو قدموں کے نشاں ڈھونڈتی ہے

یہ جو اک آس لگی بیٹھی ہے دیوار کے ساتھ
کون ہے؟ پوچھ اِسے کس کو کہاں ڈھونڈتی ہے

گھر کے آنگن میں اسے چھوڑ کے آئی ہے کہاں
گھر سے نکلی ہے حیات اور اماں ڈھونڈتی ہے

وہ تو بے تاب تھی پر کھول کے اڑنے کے لئے
فاختہ شانوں پہ زخموں کے نشاں ڈھونڈتی ہے

دور تک یاس کا صحرا ہے امیدوں پہ محیط
کس جگہ آبِ حیات عمرِ رواں ڈھونڈتی ہے

آگ کیا دل میں لگا دی ہے کسی نے کہ یہ آنکھ
غم کی بارش میں بھی اشکوں کا دھواں ڈھونڈتی ہے

شور گلیوں میں بہت، جس کا ہے بازاروں میں
خلقتِ شہر بھی گاؤں میں مکاں ڈھونڈتی ہے

برف سوچوں میں وہ اتری ہے کہ عاصم احمد
ذائقے حسنِ تکلم کے زباں ڈھونڈتی ہے

غزل

اکرم عتیق

خطا تسلیم کرنے کی جسارت کون کرتا ہے
کسی کے سامنے اپنی شکایت کون کرتا ہے

کوئی نادار ہو، کمزور ہو، بے بس ہو، عاجز ہو
کوئی نادار ہو، کمزور ہو، بے بس ہو، عاجز ہو

کدورت کو کدورت کہنے والے تو بہت، لیکن
محبت کو محبت سے عبارت کون کرتا ہے

کبھی محفل میں تنہائی، کبھی تنہائی میں محفل
مرے جذبات سے ایسی سیاست کون کرتا ہے

یہ کون افسردگی کے شہر میں لے جاتا ہے مجھ کو
مسرت سے بھرے لمحے ودیعت کون کرتا ہے

ہنسا دیتا ہے جب چاہے، رلا دیتا ہے جب چاہے
مرے جذبوں کی دنیا پر حکومت کون کرتا ہے

غموں کے گنگ پتھر اور کبھی خوشیوں کی چپ لہریں
تصور کے سمندر سے شرارت کون کرتا ہے

بظاہر تو کوئی دکھ درد کی صورت نہیں، لیکن
مرے لمحات کو جانے قیامت کون کرتا ہے

میں ڈٹ جاتا ہوں دشمن کے مقابل اے مرے سلطان
مگر یہ حوصلہ تیری بدولت کون کرتا ہے

جسے دیکھو کیے جاتا ہے ظالم کی طرفداری
کسی مظلوم انساں کی حمایت کون کرتا ہے

کسی کی نیکیوں سے اور عبادت سے کسے مطلب
کسی پاکیزہ چہرے کی زیارت کون کرتا ہے

کسی کو دے سبق اچھائی کا فرصت کسے اتنی
برائی چھوڑ دینے کی ہدایت کون کرتا ہے

نصیحت سے بھری باتیں نہ موتی علم و دانش کے
کہ اب ایسی کتابوں کی اشاعت کون کرتا ہے

گناہوں کی کثافت میں کہیں گم ہو گیا کردار
ب اس دولت کی دنیا میں حفاظت کون کرتا ہے

محبت سے بھرے دو دل امانت ہو گئے باہم
عتیقؔ اب دیکھئے پہلے خیانت کون کرتا ہے

فکر کے نئے زاویے

ڈاکٹر خیال امروہی

جتنے غم مشرقی انسان سے مربوط ملے
مغربی طرز تمدن کا تو مقسوم نہیں
زندگی اس سے ہے ناراض خدا بھی ناراض
کیوں یہاں آدمی مقہور ہے معلوم نہیں

چند عنوان ہی ہر روز بیاں ہوتے ہیں
زندگی کیا ہے اجل کیوں ہے گزر کیسے ہو
بھوک اور جنس کے پروردہ صدا دیتے ہیں
بھیک سے عمر گراں بار بسر کیسے ہو

جانے وہ جذبۂ گفتار کہاں جا نکلا
ایک بے نام سی مغموم فضا طاری ہے
اب تو جس لمحۂ موجود نے گھیرا ہے ہمیں
وہ تو اک پوری صدی سے بھی کہیں بھاری ہے

دل سے تا ذہن کئی فاصلے آ جاتے ہیں
وسوسے جرأت کردار کو کھا جاتے ہیں
پھر بھی کچھ ایسے ادارے ہیں جو تنہائی میں
شب کی وحشت کو چکا چوند بنا جاتے ہیں

بچ کر نہ جا سکو گے زمانے کے قہر سے
لاوا پھٹے گا دیکھنا ہر ایک شہر سے
کیا جانے کس مقام پہ تریاق ہو نصیب
اب تک تو صرف زہر ہی پایا ہے دہر سے

وہ تعفن ہے کہ محسوس ہوا دم نکلا
اپنی تاثیر میں ہر لمحہ یہاں سم نکلا
نار دوزخ ہے مقدر میں تو مل جائے گی
زندگی میں تو ہر اک شہر جہنم نکلا

عمر بے رنگ عجب طور گزاری ہم نے
میلی پوشاک بدن سے نہ اُتاری ہم نے
فکر کو بیچ کے کھائے نہ مرغن لقمے
زندگی جھوٹ سے ہرگز نہ سنواری ہم نے

عصر زوال دیکھتے برسوں گزر گئے
انسانیت کی لاش ہی دیکھی جدھر گئے
زردار کیف و عشق کے موتی نگل گیا
مفلس تلاشِ رزق میں کوڑے پہ مر گئے

مجھے ہے فخر کہ میں اس زمیں کا باسی ہوں
شعاع مہر تمنا ہوں انعکاسی ہوں
امیر شہر اضافی مجھے سمجھتا ہے
اُسے بتا میں اضافی نہیں اساسی ہوں

جام شب تاب، سحر خیز ہے کچھ دیر چلے
اس سے پہلے کہ مکافات کا اندھیر چلے
چار لمحے تو مصیبت سے میسر ہو نجات
امن و آرام کا سکہ بھی تو کچھ دیر چلے

نوشی انجم

خود کلامی

بڑا ہی خشک موسم ہے
یہ میری ذات کا
خود سے جھگڑنے کا......
یہ کیسا دور آیا ہے
کہ سب کچھ منجمد سا ہے
یہ لگتا ہی نہیں
دن بھی گزرتا ہے......؟
پرندے اور نہ پیلے پھول آنگن میں
بڑا ہی خشک موسم ہے
نہ بارش نا ہوائے شب میں کوئی خودکلامی
نا کوئی تارا............؟
کسی بچھڑے ہوئے کے لوٹ آنے کا
کوئی پیغام دیتا ہے............
مگر جو کچھ بھی تھا سچ تھا
مجھے ڈر ہے
مرے لفظوں کو بھی نہ موت آ جائے............؟؟؟

سید عامر سہیل

خواب اور حقیقت

تھی مرے سامنے زندگی
تھی مرے سامنے کھوکھلے قہقہوں سے بھری عارضی سانس لیتی ہوئی زندگی
جس کی آنکھیں اماوس کی راتوں کی مانند تاریک تھیں
زرد ملبوس میں وہ خزاں سے چرائی ہوئی شام تھی
اُس کی سانسوں میں، ملبوس میں، خون کی بس تھی
میں ڈرا اور اچانک مرے جسم میں خوف کی لہر انگڑائی لے کر اٹھی
میری آنکھیں کھلیں
میری آنکھیں کھلیں تو میں خوابوں کے محبس سے نکلا ہوا شخص تھا
میرے چاروں طرف کھوکھلے قہقہوں سے بھری عارضی سانس لیتی ہوئی زندگی اپنے جوبن پہ تھی
میں بہت دیر تک خواب کی کیفیت میں تڑپتا رہا
میں بہت دیر تک سوچتا ہی رہا
''یہ مرا واہمہ تھا کہ اِک خواب تھا''............؟؟
''یا مجھے زندگی کی شکستہ حقیقت کا ادراک ہونے لگا............''
''یہ مرا واہمہ تھا............مگر............''
''زندگی میں بہاریں بھی ہیں، چاند تارے بھی ہیں
روشنی بھی، کرن بھی، خوشی بھی تو ہے......
موسموں کے بدلتے ہوئے ذائقے، رنگ و خوشبو میں ڈوبا ہوا یہ جہاں......
خواہشوں کے محل، وصل کی کیفیت، کیف و مستی میں ڈوبے ہوئے رات دن............؟
میں بہت دیر تک سوچتا ہی رہا
کہ ''مرا خواب کیا تھا اگر زندگی کی حقیقت یہی کیف ہے''............؟؟
''کیا خبر خواب تھا یا حقیقت تھی وہ''...... میں نے سوچا بہت
''زندگی جو کھلی آنکھ سے میرے ادراک میں آ رہی ہے وہ کیا ہے......؟
حقیقت ہے یا پھر کوئی خواب ہے..................؟؟؟
میں بہت دیر تک سوچتا ہی رہا
میں بہت دیر تک سوچتا ہی رہا

حروفِ زر (قارئین کے خطوط)

''انگارے'' کا شمارہ نمبر ۸ موصول ہوا۔ خوشی کا مقام ہے کہ اتنی کم مدت میں یہ رسالہ علمی وادبی حلقوں میں معیار کے اعتبار سے اپنا مقام بنا چکا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں غلام حسین ساجد کا مضمون ''نقش کوئی کمال کا'' محمد خالد کی غزل کے جائزے پر مبنی ہے۔ یہ مضمون جہاں اُردو غزل کے ایک اُفق کی نشاندہی کر رہا ہے وہیں بہت سے مغالطّوں کو بھی جنم دے رہا ہے۔ چند ایک مقامات کی طرف اشارہ کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مثلاً ایک جگہ فاضل مضمون نگار رقم طراز ہیں

''محمد خالد نے جب غزل کہنا آغاز کیا تو وہ جدید غزل کے عروج بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ زوال کا زمانہ تھا کہ اقبال ساجد نے مضحکہ خیزی اور ظفر اقبال نے اسے بداطواری کی سطح پر لا کھڑا ہی نہیں کیا تھا بلکہ اپنی کھردری انا کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتارنے میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔''

ظفر اقبال کے صرف لایعنی لسانی تجربات پر نظر رکھنے والے ناقدین ذرا فرصت نکال کر ظفر اقبال کے دس گیارہ شعری مجموعوں کو پڑھ ڈالیں تو ان کے دلائل کا بودا پن خود ان پر منکشف ہو جائے گا۔ سرِ دست ظفر اقبال کے جو دو چار شعر یاد آ رہے ہیں۔ درج کر رہا ہوں

خوشی ملی تو یہ عالم تھا بدحواسی کا
خیال ہی نہ رہا غم کی بے لباسی کا

اُتار پھینکتا میں بھی یہ تار تار بدن
اسیر خاک تھا کرنا پڑا گزارہ مجھے

یہ شکایت ایک دن مجھ سے اسے ہونا ہی تھی
ساتھ کیوں چلتا نہیں سانچے میں ڈھلتا کیوں نہیں

اس انداز کے درجنوں شعر ظفر اقبال کے کلام میں موجود ہیں۔ ظفر اقبال کی تخلیقی قوت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ بیشتر جدید غزل گو شعراء (بشمول ستر کی دہائی والے شعراء) اس کے طرزِ بیان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یقیناً دُور رَس اثرات مرتب کرنے والے زندہ اور توانا اُسلوب کو ''کلّیوں'' کے تارِ عنکبوت سے جکڑ کر دہائیوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ نیز کلیہ سازی کے جوش میں انجم رومانی کی غزل کو ایک جملے میں رَد کرنا خود غزل کے حق میں گھاٹے کا سودا ہے۔

ایک اور جگہ پر غلام حسین ساجد صاحب نے لکھا ہے: ''محمد خالد کی غزل تہذیبی خطوں کی نہیں، اجتماعی انسانی نفسیات اور اس خاکداں پر سانس لینے والے انسانی معاشرے کی غزل ہے۔''

یہاں ایک سوال یہ جنم لیتا ہے کہ کیا تہذیبی خطوں سے ماورا اجتماعی انسانی نفسیات کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''اب دیکھئے تو ستر کی دہائی کی غزل کا غالب رویہ نئی تہذیبی شناخت پیدا کرنے، اپنی روایت اور جڑوں کی تلاش اور ایک بے سمت، تاریک اور گنجلک فضا میں سے امید کا راستہ نکالنے کی سعی کرنا تھا۔''

کیا یہ رویہ صرف ستر کی دہائی کے شعراء کا ہی طرۂ امتیاز ہے یا ہر دور کے اچھے شعراء کے ہاں اس کی جھلک ملاحظہ کی جا سکتی ہے؟ کیا صرف چند الفاظ کے بکثرت استعمال سے ایک نیا تہذیبی وفکری رویہ وجود میں آ جاتا ہے؟

اچھا شعر تو خوشبو کی مانند ہوتا ہے۔ ذرا گلشنِ ادب کی سیر کو نکلیے وہ آپ کے مشامِ جاں کو معطر کر دے گا۔ محمد خالد کے ہاں اچھے اشعار یقیناً موجود ہیں لیکن غلام حسین ساجد کلیت سازی کے شوق میں جو دلائل فراہم کر رہے ہیں وہ محلِ نظر ہیں۔

اپنی انفرادیت کے اظہار کے لیے کلیہ سازی پر اتر آنا کوئی مستحسن قدم نہیں ہے۔ کلیہ سازی قطعیت کا مطالبہ کرتی ہے۔ ابہام کے پردے میں کلیے کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہوا میں گرہ لگانا۔ جب تک کلیے کے لیے معقول جواز فراہم نہ کیا جائے وہ بے وقعت ٹھہرتا ہے۔ اس لیے مبہم کلیہ سازی سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔ آخر میں ایک سوال غلام حسین ساجد سے کیا تخلیقی عمل کو دہائیوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

(عطاالرحمٰن قاضی۔ عارف والا)

جناب ابن حسن کا طویل وعمیق مکتوب خاصے کی تخلیق ہے۔ اب ہم نئے دور یعنی برباد عہد میں ایسے موضوعات کہاں سے لائیں جو اچنبہ ثابت ہوں۔ ۱۹۷۴ء سے بہت پہلے سے ترقی پسند ادب نے انسانی موضوع کے بارے جو آدرش بہم پہنچایا وہ اس دور میں نئی چیز تھا لیکن اب تو ہم سب نقل در نقل اور تکرار پہ تکرار کرتے رہتے ہیں۔ ہر تنقید کے پس منظر میں ایک عہد ہوتا ہے، روحِ عصر ہوتی ہے اب فکری ارتقا کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔ آئندہ زمانہ خلائی تسخیر کا ہوگا۔ اس دور میں نہ احساس ہوگا نہ ذہنی ادراک۔ نہ یہاں کی اقدار ہوں گی نہ محبت کا کوئی وجود۔ اب محبت کا وجود کہاں رہ گیا ہے۔ کائناتی جدل اور سماجی جدلیاتی کا تقاضہ ہے کہ تسخیر عمل میں آئے۔ ادب میں بھی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ادب کو پروپیگنڈہ کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ ادب رواں دواں خیالات کا ترجمان رہا ہے اور رہے گا۔ میرے ناقص خیال میں انسان کے لیے سب سے اہم موضوع انسان ہی ہے، اس کی بہتری، برتری اور عظمت کے لیے جو کچھ سوچا جاتا ہے وہی ادب کہلاتا ہے۔

ماہنامہ ''انگارے'' میں آپ جن اہلِ قلم اور اربابِ فکر ونظر کی تخلیقات شائع کرتے ہیں اہلِ مطالعہ کے لیے مزید استفادے کا باعث ہیں جنہیں پڑھ کر مزید مطالعے کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔ یہی خصوصیت ادبی تخلیقات کا جزو کہلاتی ہیں۔ ہمارے جدید شعراء فکر انگیز شاعری کر رہے ہیں، شاعری خود

تنقید ہوتی ہے اسی لیے تمام فنون لطیفہ میں اس کا مقام بلند رہا ہے لیکن اب کیبل دور میں تقریباً سبھی زبانوں کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے۔ اب صرف سمعی بصری سہولیات نے دماغی فکر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا ہے جب ہم کوئی مقالہ یا شعر کہتے ہیں یا ہو جاتے ہیں تو معاً خیال آتا ہے کہ شاید ہم احمق اور خفقانی مخلوق ہیں جو آج کی نسل شاعر ادیب، مفکر، مفلس کو حیوان تصور کرنے لگی ہے۔ افسوس ہے اس جدید ٹیکنالوجی کے ارتقا پر اور لعنت ہے اس قسم کے تمدن کی پشت پناہی کرنے والوں پر جن کی بدولت اہل علم کا منہ کالا ہوا۔ میں قدرے جذباتی ہو جاتا ہوں اس لیے اپنے کرب ذات کا چیپٹر بند کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر خیال امروہی۔ لیہ)

یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے اپنے پرچے کی اشاعت میں باقاعدگی اور تسلسل کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ آٹھ اشاعتوں کے بعد ''انگارے'' کا مخصوص مزاج بھی بن گیا ہے، بالخصوص آپ کے اداریوں کے حوالے سے۔ اس بار بھی اداریہ اُسی نقطۂ نظر کے تسلسل میں ہے، جس کا اظہار آپ ''انگارے'' کی پہلی اشاعتوں میں کر کے رہے ہیں۔ اس سے تکرار کا احساس بھی ہوا۔ بہر کیف آپ کی ''چند باتیں'' ادبی و سماجی صورت حال پر غور و فکر پر مائل کرتی ہیں۔ مضامین کا حصہ کافی بہتر ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی (مرحوم) اور غلام حسین ساجد کے مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ''کتابوں پر تبصرہ'' کا گوشہ اچھا ہے، اسے جاری رکھیں۔

خطوط کے حصے ابن حسن کا طویل خط چھپا ہے۔ اس میں جن مسائل پر بات کی گئی ہے، ان پر بہت گفتگو ہو چکی ہے، جذباتی بھی اور عالمی بھی، ابن حسن نے جس زاویۂ نظر سے اُردو ادب پر رائے زنی کی ہے، وہ کلاسیکی مارکسی ہے، جسے اب Vulgar خیال کیا جانے لگا ہے۔ جہاں سے یہ نظریہ لیا گیا تھا، وہاں اس کی نئی نئی تعبیریں کی گئی ہیں اور نئی تعبیرات کی روشنی میں جدیدیت اور ترقی پسندی میں وہ فاصلہ موجود نہیں رہا، جو پہلے سمجھا گیا تھا اور جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان خوب ''تو تو میں میں'' ہوئی تھی اور دونوں کے برتن الگ ہو گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اب یہ بات قبول کر لی گئی ہے کہ ہر ادب پارے میں سماجی اور ثقافتی سروکار موجود ہوتے ہیں۔ سماج سے علیحدگی ایک مفروضہ ہے اور کسی تحریر کے ادبی مرتبے تک پہنچنے کے لیے اس کا فنی جمالیاتی اصولوں کی اوّلیت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ یعنی یہ مان لیا گیا ہے کہ ادبی اور سماجی قدر میں بُعد نہیں اور یہ سب بعد جدید تنقیدی مطالعات کے طفیل ہوا ہے

(ناصر عباس نیّر۔ جھنگ)

تازہ شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ ابھی صرف حصہ شاعری پڑھا ہے۔ جناب سعید اقبال سعدؔی کے درج ذیل دو اشعار فکری اور فنی حوالے سے باکمال ہیں:

کیسے پھر وہ شعر کوئی سوچے گا اپنا
شاعر کا جب ذہن بھکاری ہو جاتا ہے
وقت کے لمحے جب سوداگر بن جاتے ہیں

انساں خود ہی کاروباری ہو جاتا ہے

ان اشعار میں ان کے تخیل کا عصری شعور عروج پر ہے۔ مختلف رسائل و جرائد کا مطالعہ جاری رہتا ہے لیکن ایسے اشعار جنہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہے اور جو طائرِ خیال کو احساسِ ترفع بخشیں کئی مہینوں بعد پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ سعدؔی صاحب کی اس عنایت پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔

(اکرم عتیق۔ عارف والا)

اس مرتبہ غزلوں کی تعداد زیادہ تھی اور نظمیں نہ ہونے کے برابر۔ غزلوں میں احمد صغیر صدیقی کی غزلیں بھرپور تھیں اور انہوں نے کیا اچھے شعر نکالے ہیں

تلاش کرنا ہے اب کیا اندھیرے دائروں میں
ستارے رقص بناتے کہیں چلے گئے ہیں
کیا لکھیں حرف تمنا، یہاں پڑھنے والے
ایسے پڑھتے ہیں کہ جیسے نہیں پڑھتا کوئی

جب کہ سعید اقبال سعدی کی غزلیں اور سجاد مرزا کی غزل بھی بہترین کاوشیں تھیں۔ مضامین میں غلام حسین ساجد کا مضمون ''نقش کوئی کمال کا'' اور ایم خالد فیاض کا تجزیاتی تنقیدی مضمون بھرپور اور کمال کے تھے۔ یعنی اُنہوں نے کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا اور اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کیا جب کہ خالد سعید نے اوریا فلاشی کے ایک اچھے ناول کے ترجمے کی ابتدا کی ہے جس میں آج کے انسان کے داخلی و باطنی مسائل کے ساتھ سماج کی ستم ظریفیوں کا کرب لفظوں کی تہہ میں سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ دل بے اختیار خالد سعید کو یہ داد دینا چاہتا ہے ''خالد سعید ویل ڈن''

(فہیم شناس کاظمی۔ نواب شاہ)

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی) افتخار عارف (اسلام آباد) ڈاکٹر رشید امجد (راولپنڈی) احمد جاوید (راولپنڈی) غلام حسین ساجد (لاہور) محمد خالد (لاہور) جعفر شیرازی (ساہیوال) ڈاکٹر علمدار حسین بخاری (سرگودھا) غفور شاہ قاسم (میانوالی) ضیا اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ) روش ندیم (راولپنڈی) صلاح الدین درویش (اسلام آباد) ایم خالد فیاض (گجرات) خالد سنجرانی (لاہور) ناصر حسین بخاری (اسلام آباد) واصفہ جبین (راجن پور)